ڈاکٹر عبادت بریلوی

آوارگانِ عشق

اِدارۂ ادب و تنقید ○ لاہور

سلسلۂ مطبوعات ادارۂ ادب وتنقید لاہور۔ نمبر ۳

آوارگانِ عشق

(خاکے)

ڈاکٹر عبادت بریلوی، ایم اے۔ پی ایچ ڈی
پروفیسر و صدر شعبۂ اُردو پنجاب یونیورسٹی
پرنسپل
یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور

اِدارۂ اَدب وتنقید ○ لاہور

۱۹۸۰ء

تصنیف ——— آوارگانِ عشق

مصنّف ——— ڈاکٹر عبادت بریلوی

سرورق ——— سیّد انور حسین نفیس رقم

کتابت ——— محمد امان اللہ قادری

مطبع ——— اظہار سنز پرنٹرز۔ لاہور

ناشر ——— ادارۂ ادب وتنقید۔ لاہور

تاریخ اشاعت ——— ۱۹۷۹ء

قیمت ——— ۲۵ پچیس روپے

فہرست

پیش لفظ

مجاز، میراجی، ناصر کاظمی، محمد حسن عسکری اور صوفی صاحب کی شخصیتوں کے یہ خاکے مختلف اوقات میں ان دوستوں کی وفاتِ حسرت آیات پر تعزیتی مضامین کے طور پر لکھے گئے تھے۔ جس تاریخی ترتیب سے یہ لکھے گئے اور مختلف ادبی رسائل میں شائع ہوئے اب اسی ترتیب سے ان کو کتابی صورت میں یک جا کر کے شائع کیا جا رہا ہے، اس کتاب کا نام اس کے موضوع کی مناسبت سے "آوارگانِ عشق" رکھا گیا ہے۔

میرے اِن احباب میں سے ہر ایک اپنی اپنی جگہ شعر و ادب کا ایک سُتون تھا، اور انھوں نے اپنے اپنے مخصوص میدانوں میں جو گراں قدر کارنامے انجام دیے ہیں، وہ ادب و شعر کی دنیا میں ہمیشہ ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ لیکن شاعر اور ادیب ہونے کے ساتھ یہ لوگ انسانی خصوصیات سے بھی مالا مال تھے، اور ان کی یہی انسانی خصوصیات انھیں اس عہد کی اہم شخصیات بناتی ہیں

یہ میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے ان دوستوں سے قرُب حاصل رہا، اور زندگی میں انھیں بہت قریب سے دیکھنے کے مواقع ملے۔ ان کی صحبتوں میں جو تجربات مجھے ہوئے اور جو یادیں باقی رہ گئیں انھیں ان خاکوں کی صورت میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ان دوستوں کی اہمیت اور انفرادیت کے پیشِ نظر، ان کی شخصیتوں کے ان خاکوں کو، میر صاحب کی علامتی زبان میں "آوارگانِ عشق" کا نام دیا گیا ہے۔ کیونکہ جب بھی ان کی یاد آتی ہے، اور یہ یاد اکثر آتی ہے، تو میر صاحب کا یہ شعر میرے حواس پر منڈلانے اور میری روح پر چھانے لگتا ہے

آوارگانِ عشق کا پوچھا جو میں نشاں
مُشتِ غبار لے کے صبا نے اڑا دیا

ڈاکٹر عبادت بریلوی

اورینٹل کالج لاہور

۲۵ مارچ ۱۹۷۹ء

شاعرِ شہرِ نگاراں ــــــ مجاز

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہم لکھنؤ کے جوبلی کالج میں پڑھتے تھے اور شعروادب کی دنیا میں ہنگامے برپا کرتے تھے۔ اسی زمانے میں ایک سال ہم نے بڑے پیمانے پر ایک عظیم الشان مشاعرہ ترتیب دیا تھا۔ مہینوں پہلے اس مشاعرے کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ شاعروں میں بھی اس کی دھوم تھی اور سامعین میں بھی اس کے چرچے تھے۔

ہندوستان کے تمام اہم شعراء کو اس میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی، اور ان کی تعداد اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ نوجوان اور غیر معروف شعراء کو اس میں شریک کرنا مشکل معلوم ہوتا تھا، چنانچہ بڑی بحث و تمحیص کے بعد ہم لوگ اس نتیجے پر پہنچے کہ مشاعرہ صرف اساتذہ تک ہی محدود رہے گا۔

جب اس کا اعلان ہوا تو نوجوان شاعروں میں خاصی کھلبلی مچی۔ بعضے ناراض ہوئے اور سارے شہر میں ہمارے خلاف ہنگامہ برپا کر دیا، لیکن بعضوں نے سعی و سفارش سے اس بات کی کوشش بھی کی کہ کسی طرح انہیں اس مشاعرے میں شاعر کی حیثیت سے شریک ہونے کا موقع مل جائے۔ شاعروں کو عموماً اور نوجوانوں کو خصوصاً اس کا شوق تو ہوتا ہی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ طرح طرح کی سفارشیں ہمارے پاس آنے لگیں۔ چنانچہ بعض نوجوان شعراء کو مجبوراً اس میں شریک کرنا ہی پڑا۔

جب یہ صورت حال پیدا ہوئی تو میرے ایک ساتھی نے کہا "بندشیں تو اب ٹوٹ ہی گئی ہیں ایک نوجوان شاعر کو میں بھی لاؤں گا۔"

میں نے پوچھا "کون ہے وہ شاعر؟"

میرے ساتھی نے جواب دیا "اسرار الحق مجاز"

میں نے کہا: "میں نے تو تمہارے اس شاعر کا نام نہیں سنا!"

وہ کہنے لگا "ہاں، یہ نام ابھی غیر معروف ضرور ہے لیکن یہ نوجوان شاعر خوب کہتا ہے، کلام سنو گے تو پھڑک اٹھو گے۔ مجھے کئی بار اس کو سننے کا اتفاق ہوا ہے۔ ویسے وہ علی گڑھ یونیورسٹی کا طالب علم ہے لیکن آج کل لکھنؤ میں موجود ہے۔"

اور اس طرح وہ دیر تک جی بھر کے اس کا تعارف کراتا اور تعریفیں کرتا رہا۔

مشاعرے کے دن یہ صاحب آئے۔ منحنی، دبلے پتلے، کمزور سے آدمی، گندمی رنگ، چھریرا بدن، لمبی سی ناک، چھوٹا سا دہانہ، مخمور سی آنکھیں، لیکن اس میں ذہانت کی چمک، بڑے بڑے سیاہ چمکیلے بال، سر پر اونچی دیوار کی سفید گاندھی ٹوپی، علی گڑھ کاٹ کا پائجامہ، جسم پر ڈھیلی ڈھالی شیروانی، دیکھنے میں کم سخن اور خاموش، باتیں کم کرتے اور کرتے تو شرما شرما کر، الفاظ آدھے زبان سے نکلتے اور آدھے منہ ہی میں رہ جاتے۔ لیکن ہر بات میں بلا کی ذہانت، ہر فقرے میں شوخی و شرارت، جس سے ملتے اسے اپنا گرویدہ بنا لیتے۔

وقت سے ذرا پہلے آگئے تھے، اس لیے تھوڑی دیر بڑی ہی دلچسپ گفتگو رہی۔ اس تھوڑے سے وقت میں نہ جانے کتنے لطیفے ہو گئے۔ لوگوں نے گھیرا ڈال لیا۔ جو آتا وہ اس دلچسپ محفل میں شریک ہو جاتا، اور اپنے آپ کو اس کی دلچسپیوں میں گم کر دیتا۔

مجاز سے یہ میری پہلی ملاقات تھی!

یوں اس سے قبل انہیں دیکھنے کا اتفاق تو بارہا ہوا تھا۔ خصوصاً گرمیوں کے زمانے میں جب کالج اور اسکولوں میں چھٹیاں ہو جاتی تھیں۔ کبھی دیکھا امین آباد میں سائیکل پر تیزی سے چلے جا رہے ہیں۔ کبھی دیکھا کہ یکے میں بیٹھے ہیں اور حسن گنج اور ڈالی گنج کی سیر کر رہے ہیں۔ کبھی حضرت گنج میں پیدل گھوم رہے ہیں۔ لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ مجاز ہیں۔ پھر بھی وہ اپنے نستعلیق انداز سے نمایاں نظر آتے تھے اور اسی لیے ہم انہیں نہ جانتے ہوئے بھی جانتے تھے۔

ان کی شیروانی اور اونچی دیوار کی ٹیڑھی ٹوپی انہیں نمایاں کر دیتی تھی اور میں انہیں دیکھ کر یہ ضرور سوچتا تھا کہ آخر یہ کون ہو سکتا ہے؟

اس روز جب ان سے ملاقات ہوئی تو اس سوال کا جواب بھی مل گیا۔

مشاعرے میں مجاز نے اپنا کلام سنایا۔ کئی غزلیں اور نظمیں سنانے کی فرمائش کی گئی۔ کلام میں ایک نیا انداز تھا اور اس نئے انداز کے ساتھ ساتھ پختگی بھی تھی۔ پڑھنے کے انداز میں بھی ایک نیا پن تھا۔ اس زمانے میں جگر صاحب کے ترنم کی دھوم تھی۔ اکثر نوجوان پڑھنے میں انہیں کی نقل کرنے لگے تھے۔ سیدھا سادہ لیکن حد درجہ موثر اور دل آویز۔

خوب واہ واہ ہوئی۔ بڑے بڑے اساتذہ نے داد دی اور اس طرح پہلی بار مجاز ہم سے اور ہم مجاز سے متعارف ہوئے۔ اور پھر اس کے بعد ان سے برابر ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ وہ علی گڑھ سے لکھنؤ آتے رہتے تھے۔ جب بھی آتے کسی نہ کسی صورت سے ملاقات ہو ہی جاتی۔ ان ملاقاتوں میں دلچسپ باتیں ہوتیں، فقرے کسے جاتے، لطیفے سنائے جاتے۔ صرف سنائے ہی نہیں جاتے بلکہ تخلیق بھی کئے جاتے۔ کیونکہ معمولی سی بات کو لطیفہ بنا دینا مجاز کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کوئی بات بھی لطیفے سے خالی نہیں ہوتی تھی۔ لطیفوں کے ساتھ شعر و شاعری کا بھی دور ہوتا۔ مجاز جو کچھ کہتے وہ اپنے مخصوص انداز میں ضرور ہم لوگوں کو سنا دیتے اور اس طرح بعض اوقات گھنٹوں ان دلچسپ صحبتوں کا سلسلہ جاری رہتا۔

اس وقت تک لکھنؤ میں مجاز کی شاعرانہ صلاحیتوں سے بہت کم لوگ واقف تھے، لیکن علی گڑھ میں ان کی شاعری کی دھوم تھی، یونیورسٹی کے لڑکوں سے زیادہ وہ لڑکیوں کے محبوب شاعر تھے۔ ان کا کلام چھپ چھپ کر رات کی تنہائیوں میں پڑھا جاتا تھا۔ ان کے اشعار انہیں کی دھن اور انہیں کی لے، اور انہیں کے مترنم انداز میں گنگنائے جاتے تھے اور یہ جذب و شوق اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ وہ ہر لڑکی کے محبوب تھے اور شادی کے لیے ان کے نام کے قرعے نکالے جاتے تھے۔ ان کی کتاب "آہنگ" شاید اسی وجہ سے قبل از وقت چھپ گئی اور چھپنے کے بعد اس کی مقبولیت کا وہ عالم ہوا کہ بیان سے باہر ہے، عصمت نے اس

صورتِ حال کا نقشہ خوب کھینچا ہے۔ لکھتی ہیں :۔

پتلی سی کتاب، ایک روپیہ قیمت، عیدی، البقرعیدی، نمائش کے پیسوں سے چھ چھ سات سات کاپیاں خرید ڈالیں، تحفے ہیں تو آہنگ، نقد، ادھار عاریتاً، غرض سارے بورڈنگ میں آہنگ چل پڑی۔ جدھر دیکھئے چار لڑکیاں چمن کے کونے میں سر جوڑے کبھی "اندھیری رات کے مسافر کے ساتھ وشت پیمائی کر رہی ہیں، تو کبھی "بربطِ شکستہ" کے تار سلجھائے جا رہے ہیں دو "نذرِ دل" لیے بیٹھی ہیں۔ تو چار "خانہ بدوش" کے ساتھ اور چند "رات اور ریل کے ساتھ فراٹے بھر رہی ہیں کوئی بھولی بھٹکی غمگین "کسی کی یاد" میں غرق منہ اوندھائے پڑی ہے۔ کسی کی طرف انقلاب لایا جا رہا ہے تو کہیں "غدار" پر پھٹکاریں پڑ رہی ہیں۔ غرض دل و دماغ پر کچھ اس شان سے آہنگ چھائی کہ معلوم ہوتا تھا کوئی وبا بورڈنگ پر ٹوٹ پڑی ہے۔"

غرض ان دنوں وہ صحیح معنوں میں شاعرِ محفلِ وفا اور مطربِ بزمِ دلبراں تھے۔ انہیں خود بھی اس کا احساس تھا بلکہ یہ احساس ان کے لیے قریب قریب ایک الجھن کی حد تک پہنچ گیا تھا۔ بہرحال اس زمانے میں وہ اپنے آپ کو ہیرو سمجھتے تھے اور اس خیال سے پھولے نہیں سماتے تھے۔

مجاز بے حد شرمیلے آدمی تھے۔ میں نے کسی سے انہیں آنکھ ملا کر بات کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ان کی آنکھیں ہمیشہ نیچی ہی رہتی تھیں۔ لیکن اس شرمیلے پن کے باوجود، بزمِ دلبراں سے انہیں گہری دلچسپی تھی۔ "نگارانِ لکھنؤ" اور "عشوہ کارانِ علی گڑھ" کا ذکر ان کا محبوب شغلہ تھا لیکن یہ ذکر بھی وہ کبھی کھُل کر نہ کر سکے۔ یہ باتیں بھی بلیغ اشاروں، معنی خیز فقروں اور ذہانت سے بھرپور لطیفوں میں ہوتی تھیں۔ زندگی کے اس میدان میں بھی ان سے کچھ نہ ہو سکا۔ ان کی یہ دلچسپی حقیقی سے کہیں زیادہ رومانی اور عملی سے کہیں زیادہ تخیلی تھی۔ صنفِ لطیف پر یوں تو وہ جان چھڑکتے تھے، لیکن اگر عورت سامنے آجائے تو ان پر گھبراہٹ سی طاری ہو جاتی اور وہ سب کچھ بھول جانے لگتے تھے۔ ایسے مواقع پر خود ان کا وجود ایک خطرے میں پڑ جاتا تھا،

لیکن اس کے باوجود انہیں مُطرب بزمِ دلبراں بننے کی آرزو تھی اور شاید یہی آرزو تھی جو انہیں علی گڑھ میں میرس روڈ کے چکّر لگانے، لکھنؤ میں حضرت گنج اور امین آباد کا طواف کرنے اور دلّی میں کناٹ پیلیس اور چاندنی چوک کی سڑکیں ناپنے کے لیے مجبور کرتی تھی۔ چنانچہ گھومنا اور سیر کرنا ان کے مزاج کا جُزو بن گیا تھا۔ کبھی دیکھا کہ تیزی سے سائیکل پر چلے جارہے ہیں، کبھی دیکھا جھومتے جھامتے اکیلے ہی رواں دواں ہیں۔ کسی مقصد سے باہر نکلنا تو وہ جانتے ہی نہیں تھے۔

جب بھی پوچھا "کہو بھئی کدھر کا ارادہ ہے؟"

جواب ملا۔ "یونہی نکلے ہیں"

اور وہ واقعی ہمیشہ بس یونہی نکلتے تھے۔ مقصد کوئی نہیں ہوتا تھا۔ سوائے اس کے کہ سیر کی جائے۔ بزمِ دلبراں نہ ہو تو وہ حُسنِ رہ گذر ہی سے محظوظ ہو لیتے تھے۔ یہی ان کی دُنیا تھی۔ اس سے آگے بڑھنا انہیں نہیں آتا تھا۔ انہوں نے اس سلسلے میں کوئی کارہائے نمایاں انجام نہیں دیے۔ دور سے دلچسپی لینا اور محظوظ ہونا ہی ان کا شعار تھا۔ اس صورتِ حال نے ان کی زندگی میں محرومی کے احساس کو بہت نمایاں کیا، اور اس میں شک نہیں کہ سر سے پاؤں تک وہ اِسی محرومی کی تصویر تھے۔ لیکن اس محرومی نے ان کے یہاں آتشِ شوق کو تیز تر کر دیا تھا۔ وہ گرجتے بہت تھے لیکن گرجنے والے بادلوں کی طرح انہیں برسنا نہیں آتا تھا۔ "نگارانِ لکھنؤ" اور "عشوہ کارانِ علی گڑھ" ان کی اس کمزوری سے خوب واقف تھے۔ چنانچہ اس سلسلے میں ان سے خاصی چھیڑ چھاڑ بھی جاری رہتی تھی، اور اس چھیڑ چھاڑ میں خاصے تغزّل کا احساس ہوتا تھا۔

یہاں مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔

ایک دن مجاز ہماری یونیورسٹی میں آئے اور ہم لوگوں کو دیکھتے ہی کہنے لگے "غضب ہو گیا"

میں نے کہا "خیر تو ہے۔ کیا کوئی تازہ گُل کھلایا ہے جناب نے!"

کہنے لگے: "بس نہ پوچھو۔ موجِ خون سر سے گزر گئی۔"

میں نے کہا "آخر ہوا کیا؟"

بولے "کل مطرب بزم دلبراں واقعی بزم دلبراں میں پھنس گیا۔"

میں نے کہا "مبارک ہو، یہ تو خوشی کی بات ہے منہ مانگی مراد بر آئی لیکن اس میں پھنس جانے کی کیا بات ہے؟"

کہنے لگے "واقعی پھنس گئے تھے یار! مشکل سے چھوٹے ہیں۔"

میں نے کہا "چلو خیریت گزری، لیکن آخر معاملہ کیا تھا؟"

کہنے لگے "معاملہ کیا تھا، کل آئی ٹی کالج (لکھنؤ یونیورسٹی کا گرلز کالج) میں ایک جلسہ تھا۔ اس جلسے میں مجھے لڑکیاں پکڑ لے گئیں اور وہاں لے جا کر میری وہ گت بنائی کہ بس کہنے کو نہیں۔ طے یہ پایا کہ صرف ہم سے کلام سنا جائے گا۔ خیر کلام تو ہم نے سنایا۔ لیکن اس پہ جو فقرے بازیاں ہوئیں، انہوں نے اپنے تو چھکے چھڑا دیے اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ پھر ہم اپنا کلام اپنے ہی انداز میں لڑکیوں سے سننے لگے اور یہ کلام سنانا کیا تھا ——— کارٹون بنانا مقصود تھا۔ مردوں میں ہم اکیلے تھے، بس نہ پوچھو کیا گزری۔"

اور اس طرح دیر تک وہ اس داستان رنگین کو فردوس گوش بنا کر سناتے رہے۔ ہم سب نے اس سے خوب لطف لیا اور ہفتوں یہ واقعہ یونیورسٹی میں موضوع گفتگو بنا رہا۔

یہ تو خیر ایک واقعہ تھا۔ مجاز کی زندگی میں اس طرح کے ان گنت واقعات ہیں جن سے اس حقیقت کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ صحیح معنوں میں مطرب دلبراں تھے۔ اور ایک زمانے میں تو لڑکیاں ان پہ جان چھڑکتی تھیں اور اس کا اظہار اس طرح ہوتا تھا کہ وہ بے چارے حیران و پریشان رہ جاتے تھے، لیکن اس میں ان کے لیے دلچسپی کا بڑا سامان تھا۔

مجاز کچھ ایسے خوب صورت آدمی نہیں تھے، لیکن ان کی شخصیت میں بلا کی دلکشی تھی اور اس لیے وہ سب کے محبوب تھے۔ ان کی معصومیت لوگوں کو سب سے زیادہ متاثر کرتی تھی۔ بھولا پن سب سے زیادہ اپنی طرف متوجہ کرتا تھا اور اس معصومیت

اور بھولے پن کے ساتھ ساتھ ان کی لطیفہ سنجی اور فقرہ تراشی تھی جو ہر ایک کو اپنا گرویدہ بنا لیتی تھی۔

یہ بات ایسی کچھ عجیب نہیں ہے کہ مجاز نے ساری زندگی کچھ بھی نہیں کیا۔ نہ سنجیدگی سے پڑھا لکھا، نہ باقاعدگی سے کوئی ملازمت کی اور نہ کسی کام کی طرف صحیح طور پر متوجہ ہوئے۔ مجاز کی طبیعت میں ایک لاابالی پن تھا۔ ایک ایسا لاابالی پن جو رومانی مزاج کی گھٹی میں پڑا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجاز کے لیے سنجیدگی سے کچھ کرنا تو درکنار کسی ایک جگہ پر زیادہ دیر تک بیٹھنا بھی ناممکن تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی مُتلوّن مزاجی ساری زندگی انہیں کشاں کشاں لیے پھرتی رہی اور کہیں بھی انہیں چین نہ ملا۔ ان کے جسم میں ایک بے چین اور بے قرار روح تھی جو انہیں کسی کل چین نہ لینے دیتی تھی۔ اس لیے مجاز نے زندگی میں سوائے شاعری کے کچھ نہ کیا اور ایک زمانہ ایسا بھی آیا جب وہ شاعری بھی نہ کر سکے اور اس طرح مرنے سے بہت پہلے مر گئے۔

علی گڑھ چھوڑنے کے بعد انہیں ریڈیو میں ایک ملازمت مل گئی تھی اور وہ کچھ عرصے دِلّی میں رہے بھی تھے لیکن ملازمت کرنے کی بجائے وہ تفریح کرتے تھے۔ کام میں ان کا جی نہیں لگتا تھا۔ کسی کو وہ خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ کسی کے ماتحت رہنے سے انہیں چڑ تھی۔ اس لیے وہ زیادہ عرصے تک ریڈیو میں نہ چل سکے۔ اور بالآخر انہیں اس سے کنارہ کشی ہی اختیار کرنی پڑی۔

اور اس کے بعد ان کا بیشتر وقت بے کاری ہی میں گزرا۔ کچھ عرصے کے لیے دِلّی کی ہارڈنگ لائبریری میں انہیں جگہ ضرور مل گئی تھی لیکن لائبریری کی ملازمت بھی ان کے بس کی بات نہ تھی۔ اس لیے کچھ عرصے کے بعد اس ملازمت کو بھی وہ خیرآباد کہنے کے لیے مجبور ہو گئے۔

اور پھر دِلّی اور لکھنو کی سڑکوں پر آوارہ گھومنے کے سوا ان کا کوئی مشغلہ نہ تھا۔ اسی عالم میں انہیں مسرّت حاصل ہوتی تھی اور ان کو اس عالم میں دیکھ کر ہمیشہ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اسی کام کے لیے بنے ہیں۔ وہ ایک آزاد منش تھے اور انہیں صرف اسی ماحول

میں موانست کا احساس ہوتا تھا۔ جہاں کسی قسم کی پابندی نہ ہو، اس لیے ملازمت کے زمانے میں شکوہ و شکایت ان کا شعار بن جاتا تھا جو بھی ملتا اس سے کہتے۔

"آج کل ہم پابہ زنجیر ہیں، قیدی ہیں۔ یہ بھی کیا زندگی ہے۔ دیکھو انسان کو اس زندگی میں کیا کیا کچھ کرنا پڑتا ہے۔"

ایک دن مجھ سے زمانے کی بڑی شکایت کی اور کہا۔ "دیکھو انسانوں کو کیسے کیسے جبر سہنے پڑتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "یہ تو زندگی کا قانون ہے۔"

بولے "اسی لیے تو ہم اس قانون کو توڑتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "یہ تو کوئی اچھی بات نہیں۔"

کہنے لگے "ہم ترقی پسند ہیں۔"

اس فقرے پر مجھے ہنسی آگئی۔ میں مجاز سے بحث کیا کرتا۔ وہ ہمیشہ سنجیدہ بات کو کسی غیر سنجیدہ بات بلکہ لطیفے پر ختم کر دیتے تھے۔ اور ایسے موقع پر مجھے ہمیشہ ان پر پیار آجاتا تھا۔

مجاز کی زندگی میں انتشار کی کیفیت تھی۔ باوجود اپنے سبک اور سڈول ناک نقشے اور نستعلیق انداز کے ان کے چہرے سے پریشانی ٹپکتی تھی۔ ایک کرب کا سا عالم نظر آتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ شخص کسی بڑی تکلیف میں مبتلا ہے۔ اس کرب کی تاریکی میں کبھی کبھی تیز روشنی کی کرن ضرور چمکتی تھی لیکن اس سے تاریکی کا احساس اور بھی شدید ہو جاتا تھا۔

مجاز کی باتیں مزہ دیتی تھیں۔ ان پر بے اختیار ہنسی آجاتی تھی۔ لیکن یہ باتیں شخصیت کے کرب کو کم نہیں کرتی تھیں بلکہ اس میں کچھ اضافہ ہی کر دیتی تھیں اور اس کے جاننے والے، اس کی باتوں پر ہنسنے والے، اس سے محفوظ ہونے والے، ہمیشہ یہ محسوس کرتے تھے کہ یہ شخص جو دوسروں کے لیے اتنی مسرّتوں کا سامان فراہم کرتا ہے خود ان مسرّتوں سے محروم ہے۔ اس کی زندگی میں تو غم ہی غم، کرب ہی کرب ہے اور وہ اسی غم اور کرب کا مجسمہ ہے۔

یہ کرب کی سی کیفیت، جس کا رنگ مجاز کی زندگی میں اس قدر نمایاں تھا، بغیر

کسی سبب کے نہیں تھی۔ اس کے پیچھے داستانیں تھیں۔ مجازیوں تو گل نغمہ اور پردۂ ساز نظر آتے تھے لیکن درحقیقت زندگی کے حالات نے انہیں خود اپنی شکست کی آواز بنا دیا تھا۔ مجاز کی زندگی ایک ناکام زندگی تھی۔ انہوں نے جو کچھ بھی چاہا وہ نہ ہو سکا۔ آرزوں اور تمناؤں کے جو رنگ محل انہوں نے تعمیر کرنے چاہے وہ زمین پر آ رہے اور اس رنگ محل میں امیدوں کے جو چراغ فروزاں کئے وہ اس طرح بجھے کہ پھر کبھی نہ جل سکے۔ اس صورت حال نے خود مجاز کو ایک شمعِ کشتہ بنا دیا اور وہ ساری زندگی محفل آرائی کی تمام خصوصیات اپنے اندر رکھنے کے باوجود زینتِ محفل نہ ہو سکے۔

مجاز کو شمع کشتہ بنا کر بجھانے میں تمام تر ان کی زندگی کی ناکامیوں کو دخل تھا۔ یہ ناکامیاں ہمیشہ ان کے دم کے ساتھ رہیں، اور پھر ناکامیوں کا یہ احساس ان کے یہاں اس حد تک بڑھا کہ وہ ہر کام سے گھبرانے لگے۔ انہوں نے محبت کی، لیکن وہ محبت کے قابل سمجھے جانے کے باوجود اس کے قابل نہ سمجھے گئے۔ اس سلسلے میں انہوں نے جو کچھ چاہا وہ نہ ہو سکا۔ ان کی محبت ایک معمّہ تھی اور معمّہ ہی رہی۔ ایک تماشا تھی تماشا ہی رہی۔ اور وقت کے ساتھ ان کی محبت ایک ہنگامہ بن گئی اور اس ہنگامے نے خود ان کی زندگی کو ایک ہنگامہ بنا دیا۔ جس سے وہ مرتے دم تک دوچار رہے اور زیرِ خاک بھی اس ہنگامے کو ساتھ لے گئے۔

یہ زندگی کی پہلی ٹھوکر تھی اور اس کے بعد وہ ٹھوکریں کھا کر گرتے ہی رہے۔ یہاں تک کہ انہیں اپنے آپ کو سنبھالنا بھی دشوار ہو گیا اور یہ حقیقت ہے کہ وہ آخر وقت تک اپنے آپ کو سنبھال نہ سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ساری زندگی انہوں نے ایک انتشار کے عالم میں کاٹی اور اسی انتشار نے انہیں ساری زندگی رنج و غم کا ایک پیکر بنائے رکھا اور اس رنج و غم کی آگ میں وہ ساری زندگی جل جل کر تڑپتے اور تلملاتے رہے۔

اس صورت حال کا یہ اثر تھا کہ وہ زندگی کے شیدائی ہونے کے باوجود اپنے آپ کو اس کے قابل نہیں سمجھتے تھے۔ ہمیشہ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے زندگی ان کی طرف بھاگ رہی ہے۔ ان کا پیچھا کر رہی ہے اور وہ اس سے بچنے اور اس سے فرار اختیار کرنے کی کوشش کر

رہے ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ تو وہ کچھ نہ کرنے اور وقت ضائع کرنے میں پناہ ڈھونڈتے تھے یا پھر شراب کو اپنا مونس و دمساز بنا کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جانا چاہتے تھے۔ انہیں خود بھی اس بات کا احساس رہتا تھا کہ وہ کچھ نہیں کرتے، صرف وقت ضائع کرنے کے سوا ان کا کوئی مشغلہ نہیں۔ لیکن اگر کوئی دوسرا اس موضوع پر ان سے گفتگو کرے اور انہیں اس حقیقت کا احساس دلائے تو وہ ہمیشہ اسے مذاق میں ٹالنے کی کوشش کرتے۔

میں نے کئی بار ان سے اس موضوع پر گفتگو کی۔ لیکن ہمیشہ یوں محسوس ہوا جیسے اس موضوع کی ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہے، اور وہ اس سے دامن بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ایک دن میں نے سنجیدگی سے کہا "انسان کو کچھ نہ کچھ کرنا ضرور چاہیئے ورنہ زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔"

کہنے لگے "زندگی تو یوں بھی اجیرن ہے۔ کرنے نہ کرنے سے کیا ہوگا؟"

میں نے کہا "نہیں، یہ بات نہیں۔ زندگی کو بسر کرنے کے قابل بھی بنایا جا سکتا ہے۔"

مجاز نے کہا "اس کی ایک صورت ہے وہ یہ کہ زندگی کو بھلا دیا جائے۔"

میں نے کہا "یہ تو غیر ترقی پسندانہ بات ہے۔"

جب گفتگو اس منزل پر پہنچی تو مجاز نے کہا "چھوڑو یار! ان باتوں میں کیا رکھا ہے۔ آؤ کہیں چلتے ہیں۔ ترقی پسندوں کو گھومنا پھرنا چاہیئے۔ سیر کرنا سب سے بڑی ترقی پسندی ہے۔"

اس قسم کی سنجیدہ گفتگو کا ان کے ہاں ہمیشہ یہی انجام ہوتا تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ ان کی زندگی میں مسلسل اور پیہم ناکامیوں نے اس درجہ غم پیدا کر دیا تھا کہ ان کے لیے زندگی میں کوئی کشش باقی نہیں رہی تھی اور وہ اس غم کو غلط کرتے پھرتے تھے۔ ان کا گھومنا پھرنا، دوستوں سے ملنا، فقرے تراشنا اور لطیفے بنانا، ان سب کی محرک یہی صورت حال تھی۔ انہیں کے سہارے وہ غم غلط کرتے تھے اور اس طرح وقت کے کٹنے کی صورت نکل آتی تھی، ورنہ وقت تو ان سے کاٹے نہیں کٹتا تھا۔

مجاز جب تک زندہ رہے ان کے پاؤں میں چکّر رہا۔ شاید ہی زندگی میں کوئی دن ایسا ہو جب وہ جم کر گھر بیٹھے ہوں۔ دن بھر بس اِدھر اُدھر گھومتے ہی رہتے تھے۔ ابھی دیکھا یونیورسٹی میں کھڑے کچھ لوگوں سے باتیں کر رہے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد دیکھا حضرت گنج چلے جا رہے ہیں۔ کافی ہاؤس میں بیٹھے ہیں، امین آباد کا چکر لگا رہے ہیں۔ غرض سارا دن اسی طرح گزر جاتا تھا۔ رات گئے گھر پہنچتے تھے اور وہ بھی اس حال میں کہ انہیں خود اپنی خبر نہیں ہوتی تھی۔ وہ تو خیر گھر کیا پہنچتے، پہنچائے جاتے تھے۔ اور دوسرے دن پھر یہی چکّر شروع ہو جاتا تھا۔

ان کی طبیعت میں ایک بے چینی تھی۔ ان کے مزاج میں ایک تلوّن تھا۔ وہ چین سے ایک جگہ بیٹھ نہیں سکتے تھے۔ ایک سیمابی کیفیت انہیں نہ جانے کہاں کہاں لیے پھرتی تھی اور یہ سب کچھ اس لیے تھا کہ وہ مسرّتوں سے محروم تھے اور ان کی زندگی میں جو غم تھا وہ ہر گھڑی کچوکے سے لگاتا رہتا تھا۔ اس احساس کو کم کرنے کے لیے وہ مارے مارے پھرتے تھے۔ چہل قدمی ان کی عادت بن گئی تھی۔ کوئی مِل جائے تو خیر ورنہ وہ اکیلے ہی اس مشغلے کو جاری رکھتے تھے۔

یوں تو ان کا یہ مشغلہ بے مقصد تھا لیکن انہیں دیکھ کر یہ بات محسوس ضرور ہوتی تھی کہ وہ ایسا کر کے اپنی زندگی کے کسی بڑے ہی مہیب خلا کو پُر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن اس خلا کا پُر ہونا آسان نہیں تھا۔ اس لیے انہیں یہاں بھی ناکامی ہی ہوتی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ ہمیشہ اس عالم میں کسی نہ کسی ساتھی کے متلاشی رہتے تھے! ان کی نظریں کسی دوست اور ہمنوا کو تلاش کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں، کہ اس سے تنہائی کا خلا کسی حد تک پُر ہو سکتا تھا جو ان پر ایک آسیب کی طرح مُسلّط تھی۔

اور جب واقعی کوئی دوست انہیں مِل جاتا تو یوں محسوس ہوتا جیسے ان کے دل کی کلی کِھل گئی ہے اور وہ فرطِ مسرّت سے باغ باغ ہو گئے ہیں۔ حالانکہ مسرّت کے حصول سے کہیں زیادہ مسرت سے محرومی کے غم کو وہ اس طرح غلط کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ تھوڑی دیر کے لیے یہ غم غلط بھی ہو جاتا تھا۔ لیکن دیکھنے والے کو ہمیشہ یہ محسوس ہوتا تھا جیسے غم کے

سائے ان کی زندگی کے اُفق پر پھیل کر اور بھی بے کراں ہو گئے ہیں۔

یوں مجاز تنہا بہت ہی کم رہتے تھے کوئی نہ کوئی انہیں مل ہی جاتا تھا، لیکن اس کے باوجود وہ زندگی میں تنہا نظر آتے تھے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی زندگی میں تنہائی تھی اور اسی لیے وہ اس احساس تنہائی سے پیدا ہونے والے غم کو بھلانے کے لیے دوستوں اور ملنے والوں کی تلاش میں رہتے تھے اور جب کوئی دوست یا ملنے والا انہیں مل جاتا تو وہ اس کے ساتھ گھنٹوں وقت گزارتے تھے۔ دوستوں اور ملنے والوں کی تلاش اور تلاش کے بعد گھنٹوں کافی ہاؤس میں ان کے ساتھ بیٹھنا بھی ان کے معمولات میں داخل تھا۔ یہاں وہ خوش گپیاں کرتے، خود ہنستے اور دوسروں کو ہنساتے تھے۔ بس اس سے آگے بڑھنا انہیں نہیں آتا تھا۔ اگر کوئی سنجیدہ بات چھیڑ دیتا تو وہ ہمیشہ چُپ ہو جاتے تھے یا کوئی پہلو دار فقرہ ان کی زبان سے اس طرح نکل جاتا تھا کہ فضا زعفران زار بن جاتی تھی۔

میں بارہا ان کے ساتھ بیٹھا ہوں اور مجھے ہمیشہ یہ محسوس ہوا ہے کہ ان کی زندگی میں تنہائی کے خلا نے جس غم کو پیدا کیا ہے وہ اس کو اس طرح بھلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ایسی محفلوں میں وہ کچھ کھوئے کھوئے سے رہتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ حاضر نہیں ہیں۔ لوگ باتیں کرتے اور وہ خاموش رہتے اور کبھی کبھی تو یہ خاموشی اتنی گہری ہو جاتی کہ انہیں متوجہ کرنا پڑتا تا کہ انہیں اس بات کا احساس رہے کہ وہ اس محفل میں شریک ہیں۔

البتہ ان محفلوں میں جب کبھی بولتے تو ان کا فقرہ مزے دار ہوتا اور اس لیے اس میں لطیفے کا سا لطف آجاتا۔ لطیفے پہ سب لوگ تو ہنستے لیکن وہ خود ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ خاموشی میں ڈوب جاتے اور اس طرح ڈوبتے کہ انہیں بڑی مشکل سے نکال کر باہر لانا پڑتا۔

ان کی زندگی میں غم کے نہ جانے کتنے طوفان موج زن تھے غم کے شدید احساس ہی کے باعث وہ اس صورت حال سے دوچار ہوئے تھے۔ یہ زندگیاں کی تلخیاں ہی تھیں جو ان

پر شگفتگی کے باوجود اس خاموشی کو مسلّط رکھتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ہنسی کی تہہ میں بھی ایک اداسی اور غمگینی کا احساس ہوتا تھا۔ وہ ہنستے تھے، شگفتہ باتیں کرتے تھے لیکن ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے یہ سب کچھ غم غلط کرنے کے لیے کر رہے ہیں۔

مجاز بری طرح شراب پیتے تھے لیکن ان کی یہ شراب نوشی بھی اپنے آپ کو بھلانے کے لیے تھی۔ اس میں کسی قسم کا نشاطیہ پہلو نہیں تھا۔ وہ یک گونہ بے خودی چاہتے تھے۔ شراب سے انہیں جو والہانہ وابستگی تھی اس کو دیکھ کر یہ احساس ضرور ہوتا تھا۔ اسی لیے شراب کے لطیف پہلوؤں کی طرف انہوں نے کبھی بھی توجہ نہیں کی تھی۔ وہ ہر قسم کی شراب پی سکتے تھے کیونکہ انہیں تو نشے سے غرض تھی اس کے علاوہ ان کا کوئی مقصد نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے وہ دیسی شراب تک سے گریز نہیں کرتے تھے اور ایک زمانہ تو ان پر ایسا بھی گزرا ہے جب وہ "ٹھرا" ہی پیتے تھے۔

اور یہی شراب انہیں کھا گئی۔

شراب کے سرور سے انہیں سروکار نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ پیتے تھے تو بس پیتے ہی چلے جاتے تھے اور جلد ہی ایک ایسی منزل آجاتی تھی جب انہیں دنیا و مافیہا کا خیال ہی نہیں رہتا تھا۔ اور وہ اپنے آپ اور گرد و پیش سے بے خبر ہو جاتے تھے، اس عالم میں دیکھنے والوں کو یوں محسوس ہوتا جیسے وہ اسی غرض سے پی رہے تھے کہ جلد سے جلد بے حال ہو کر اپنے آپ سے باہر ہو جائیں۔ اسی لیے اس عالم میں ان کو دیکھ کر ہمیشہ افسوس ہوتا اور ترس آتا تھا اور حقیقت بھی یہی ہے کہ نشے کے عالم میں جب ان پر بدمستی کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی تو وہ واقعی رحم کے قابل ہوتے تھے۔

میں نے مجاز کو پیتے اور پی کر اس طرح بے حال ہوتے ہوئے بارہا دیکھا ہے اور ہمیشہ یوں محسوس ہوا ہے جیسے یہ شخص زندگی سے منہ موڑ کر تیزی سے اپنی موت کی طرف بھاگا جا رہا ہے۔

جوش صاحب کی محفل نا و نوش میں انہیں دیکھا اور انہیں دیکھ کر ہمیشہ یہ محسوس

ہوا کہ وہ زیادہ سے زیادہ مقدار میں شراب جلد سے جلد اپنے اندر اتار لینے کے درپے ہیں۔ چنانچہ تیزی سے پینے اور زیادہ پینے کی کوشش کرتے۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ بہت جلد بہکنے لگتے اور تھوڑی دیر کے بعد انہیں ہوش نہ رہتا۔

جوش صاحب کو ہمیشہ ان کی اس حالت پر افسوس ہوتا۔ وہ اس پر کڑھتے۔ مجاز کو بُرا بھلا کہتے۔ شفقت بھرے انداز میں نصیحت کرتے لیکن مجاز کب سنتے تھے۔ بالآخر جب اس رندِ بلانوش کی حالت زیادہ خراب ہوتی تو جوش صاحب کہتے۔

"لے جاؤ اس کو!"

غرض مجاز لے جائے جاتے۔ ان کے اعصاب نے جواب دے دیا تھا۔ شراب ان کی برداشت سے باہر تھی، لیکن اس صورت نے شراب کے معاملے میں ان کی حالت ایک ایسے بیمار کی سی کردی تھی جو کھانا کھا نہیں سکتا۔ لیکن کھانے کی ہوس جس کے یہاں شدید سے شدید تر ہو جاتی ہے۔ مجاز کو شراب کا ہوکا ہو گیا تھا۔

یہ صحیح ہے کہ مجاز کی شراب نوشی کا محرّک یک گونہ بے خودی کا خیال ہوا! انہوں نے ہمیشہ اپنی زندگی کے بے پایاں غم کو بھولنے کے لیے شراب پی لیکن آخر میں تو یہ حال ہو گیا تھا کہ وہ بغیر کسی خیال کے پیتے تھے۔ مجھے ہمیشہ یہ محسوس ہوتا تھا کہ مجاز کو شراب کی ایسی لت پڑ گئی ہے کہ اپنے آپ پر قابو نہیں رہا ہے۔ بس ہر وقت وہ شراب کے خیال میں سرگرداں رہتے تھے۔ ان کی زندگی کا کوئی مقصد ہی نہیں رہا تھا، جب ملتے تو شراب کا ذکر کرتے۔ شراب نہ ملتی تو شراب کی باتیں کرتے۔ خصوصاً ان لوگوں کی صحبت میں جنہیں شراب سے دور کا بھی واسطہ نہیں، اور جو خود بقول مجاز اس معاملے میں زاہد خشک ہیں، وہ شراب کی باتیں کچھ زیادہ ہی کرتے اور ان باتوں میں حسن طلب کے ساتھ ساتھ ایک احساس مسرت کا بھی ہوتا تھا۔

شام کو کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ مجاز ہمارے ساتھ بیٹھتے اور ہم لوگ چائے یا کافی پیتے۔

میں چائے یا کافی کی پیالی بڑھا کر کہتا۔ "لو بھئی چائے پیو"۔
اس فقرے پر وہ مسکرا کر ٹھنڈی سانس لیتے اور کہتے۔
"اچھا!"
مجھے اس پر ہنسی آجاتی اور میں چھیڑنے کی غرض سے کہتا "کیوں، کیا چائے پینے کو جی نہیں چاہ رہا ہے"۔
پھر ٹھنڈی سانس لے کر جواب دیتے "جی تو چاہ رہا ہے۔ پی لیں گے۔ لیکن یار چائے یا کافی بھی کوئی پینے کی چیز ہے"۔
میں پوچھتا "پھر پینے کی چیز کیا ہے؟"
وہ کہتے "جس کو تمہارے ایسے لوگ نہیں پیتے"۔
غرض وہ جتنی دیر بیٹھتے اس طرح کی باتوں کا سلسلہ جاری رہتا۔ وہ بیٹھتے تو ہمارے ساتھ تھے لیکن انہیں خیال شراب کا رہتا تھا۔ اور چائے یا کافی پینے کے بعد شراب کی تلاش میں نکلتے تھے۔ کوئی پینے والا مل گیا تو خیر، ورنہ حالت یہ ہوگئی تھی کہ کوئی دوست مل گیا تو اس کی جیب میں ہاتھ ڈال دیے اور جو کچھ مل گیا نکال لیا اور جا کر جیسی شراب بھی ملی پی لی اور رات گئے برے حال میں گھر پہنچے، یا پہنچائے گئے۔
مجاز کے تمام دوست اور عزیز ان کی شراب نوشی سے خائف تھے۔ جوش صاحب تک، جو خود شراب کے رسیا ہیں، مجاز کو ہمیشہ ملامت کرتے اور سمجھاتے تھے۔ لیکن مجاز اس منزل سے گزر چکے تھے جب انسان پر کسی بات کا اثر ہوتا ہے، انہیں خود اپنے اوپر قابو نہیں رہا تھا، چنانچہ اس شراب نے مجاز کی جان تک لے لی۔ ان کی شراب نوشی کا جو عالم تھا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ یہی چاہتے بھی تھے۔ زندگی ان کے لیے ایک بوجھ تھی اور اس بوجھ کو اٹھانے کی سکت ان میں باقی نہیں رہی تھی۔ اس لیے انہوں نے شراب کا سہارا لیا۔ ساری زندگی اس کے سہارے جیئے اور بالآخر اسی کے سہارے اس دنیا سے سفر کر گئے۔ رات بھر شراب پی اور شراب بھی دیسی۔ صبح کو شراب خانے

میں ادھ موئے پائے گئے۔ ہسپتال پہنچایا گیا لیکن بے سود۔ شراب نے ان کی جان لے لی یا یوں کہیے کہ شراب کا سہارا لے کر وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ کیونکہ زندگی کا زہر اب ان سے پیا نہیں جاتا تھا۔

شراب نوشی کو مجاز نے غم غلط کرنے اور زندگی کی تلخیوں کو بھلانے کے لیے اپنایا، لیکن وہ ان کے لیے مصیبت بن گئی۔ چنانچہ اس شراب نوشی نے ان سے عجیب وغریب حرکتیں بھی کرائی ہیں۔ اس بھنور میں پھنس کر وہ کبھی کبھی اپنی اس انسانیت اور شرافت سے بھی گر گئے ہیں جس کو وہ بہت عزیز رکھتے تھے۔ شراب پی کر رات گئے سڑکوں پر لڑکھڑاتے پھرنا، لوگوں سے جھگڑنا اور اول فول بکنا، ان کا شعار بن گیا تھا۔ شراب پینے کے لیے پیسے نہ ہوں تو وہ طرح طرح سے پیسے وصول کرنے کی کوشش کرتے۔ کوئی جاننے والا مل جاتا تو اس کی شامت آجاتی۔ مجاز اسے چھوڑتے نہیں تھے جو کچھ جس طرح بھی مل جاتا، وصول کر لیتے۔ شراب نہ ہو تو انہیں خیال نہیں رہتا تھا کہ وہ اس کو حاصل کرنے کے لیے کیا کیا کچھ کر رہے ہیں۔

وہ واقعہ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ چند سال پہلے مجاز پیسوں سے بہت تنگ تھے۔ ایک دن شراب پلانے والا کوئی دوست بھی نہ ملا تو ایک پبلشر کے پاس پہنچے اور اپنے مجموعۂ کلام کا معاملہ صرف پچاس روپلے میں طے کر لیا۔ پچاس روپے پبلشر نے دے دیے اور مجاز نے ان پیسوں کی شراب پی لی۔ پبلشر نے "ساز نو" کے نام سے ان کا مجموعۂ کلام چھاپ لیا۔ دوستوں کو جب اس کا علم ہوا تو انہوں نے مجاز کو خوب آڑے ہاتھوں لیا۔ انہوں نے اپنی غلطی تسلیم کر لی۔ اپنے کیے پر نادم بھی ہوئے لیکن وہ مجبور تھے بعض باتیں ان کے اختیار سے باہر تھیں۔

مجاز کے مزاج میں حد درجے کا لاابالی پن تھا۔ کسی کام کو باقاعدگی سے کرنا وہ جانتے ہی نہیں تھے۔ کسی جگہ جم کر بیٹھنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ تھوڑی دیر بیٹھتے پھر اٹھ جاتے۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ، دوسری جگہ سے تیسری جگہ۔ بس یہی

ان کا معمول تھا۔ وہ وعدے کر لیتے لیکن وعدے کو وفا کرنا انہیں نہیں آتا تھا۔ کسی کام کی تکمیل سے وہ کوئی سروکار نہیں رکھتے تھے۔

انہوں نے ساری زندگی ایک تلوّن کے عالم میں بسر کی۔ کبھی کوئی کام نہیں کیا۔ کبھی یہ نہیں سوچا کہ کیا کرنا چاہیئے۔ کسی وقت بھی انہیں مستقبل کا خیال نہیں آیا۔ وہ تو بس حال ہی کو بسر کرنا جانتے تھے اور وہ بھی کسی قاعدے اور اصول کے ماتحت نہیں۔ بے اصولی ہی ان کا اصول تھا۔ بے قاعدگی ہی ان کا معیار تھا اور زندگی میں ہر لمحے وہ اپنے اقوال و افعال سے اس بے اصولی اور بے قاعدگی کا مظاہرہ کرتے رہتے تھے اور اس کا سبب بھی یہی تھا کہ انہیں زندگی اور اس کے نظام سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ حالات نے انہیں زندگی کے ہر پہلو سے بیزار کر دیا تھا۔ وہ تو زندگی کو بھُلا دینا چاہتے تھے۔ اس لیے اس کے اصولوں اور قدروں کی بھی انہیں کوئی پروا نہیں تھی۔

میں نے مجاز کے لاابالی پن کو صرف دیکھا ہی نہیں، مجھے اس سے سابقہ بھی پڑا ہے۔ کیونکہ مجاز کی یہ مشقِ ستم احباب پر سب سے زیادہ ہوتی تھی۔

چند سال پہلے کا ذکر ہے مجاز ایک دفعہ لکھنؤ سے دلّی آئے تو میزبان کے لیے میرا انتخاب کیا۔ صبح کو دیکھا تو اپنا بکس اور بستر لیے چلے آ رہے ہیں۔

کہنے لگے "جوش صاحب کے پاس ٹھہرنے کا ارادہ تھا، لیکن سوچا اب کے تمہارے پاس ٹھہروں گا۔"

میں نے کہا "بڑی خوشی کی بات ہے لیکن آخر یکایک دلّی کا پروگرام کیسے بنا؟"

بولے بس یونہی آنکلے ہیں۔"

میں نے کہا "کوئی مشاعرہ وشاعرہ ہوگا؟"

مجاز نے جواب دیا "مشاعرہ وشاعرہ کوئی نہیں۔ بہت دنوں سے لکھنؤ میں طبیعت گھبرا رہی تھی۔ ہم نے کہا ذرا دلّی کی سیر کر لیں۔"

میں نے کہا "ہاں دلّی کی سیر تو کرنی ہی چاہیئے۔ تم نے بہت اچھا کیا۔ اب

ایک مہینہ یہیں گزارو۔ اگلے مہینے سے موسم خزاں کی چھٹیاں ہونے والی ہیں، پھر ساتھ ہی لکھنؤ واپس چلیں گے۔"

اور وہ اس پہ راضی ہو گئے۔

میں نے ان کا سامان وغیرہ رکھوایا۔ وہ نہائے دھوئے اور ناشتہ کرنے کے بعد یہ کہہ کر رخصت ہوئے کہ ذرا گھومنے پھرنے جا رہا ہوں۔ کھانے کے وقت تک واپس آجاؤں گا، لیکن جانے کے بعد تین دن تک لوٹ کر خبر نہ لی۔ خدا جانے کن لوگوں میں پھنس گئے۔ میں نے جوش صاحب کو ٹیلی فون کیا۔ انہوں نے بھی لاعلمی ظاہر کی۔ خاصی پریشانی رہی۔ لیکن تیسرے دن دوپہر کو دیکھا کہ جوش صاحب ہانپتے کانپتے میرے پاس آ کے کمرے میں داخل ہوئے اور کہنے لگے۔

"مجاز مر گیا!"

میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔

جوش صاحب کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ ان پہ رقّت طاری تھی اور یہ محسوس ہو رہا تھا، جیسے وہ کرب کی سی کیفیت میں مبتلا ہیں۔ میں نے انہیں تسلی دی اور کہا کہ

"وہ پرسوں یہاں آئے تھے۔ سامان ان کا یہ رکھا ہوا ہے۔ اس کے بعد کہیں غائب میں سمجھتا تھا آپ کی طرف ہوں گے۔ شاید کسی اور کی طرف گئے ہوں۔"

جوش صاحب کہنے لگے "صاحب! ابھی کسی نے مجھے ٹیلی فون پہ اطلاع دی کہ وہ مر گیا۔"

میں نے انہیں دلاسا دینے کے خیال سے کہا "آپ فکر نہ کیجئے، کسی نے یوں ہی غلط خبر اڑا دی ہے۔" لوگ ایسا بھی کرتے ہیں۔ اور اس طرح خوش ہوتے ہیں۔ یہ ایک نفسیاتی بیماری ہے۔"

غرض اپنے ترکش کے تمام تیر خالی کر دیئے۔ اس خیال سے کہ جوش صاحب اس واقعے

کا زیادہ اثر نہ لیں۔

تھوڑی دیر بعد میں نے جوش صاحب کو یہ کہہ کر رخصت کیا، کہ آپ جا کر آرام کیجیے، میں مجاز کو تلاش کرتا ہوں۔"

جوش صاحب تو رخصت ہوئے۔ میں نے کالج کے کچھ لڑکوں کو اِدھر اُدھر دوڑایا۔ لڑکے بہت تیز تھے۔ دِلّی کے چپّے چپّے کا انہیں علم تھا۔ مجاز کے مخصوص ٹھکانوں کو بھی جانتے تھے۔ شام تک انہوں نے مجاز کو ڈھونڈھ نکالا۔ لال کنویں میں انہوں نے کسی کے ہاں بُری طرح شراب پی لی تھی اور بے ہوش پڑے ہوئے تھے۔ لوگ یہ سمجھے کہ مر گئے۔ اس لیے کسی نے جوش صاحب کو ٹیلی فون پر اطلاع دے دی۔

خیر صبح کو مجاز جوش صاحب کے یہاں پہنچائے گئے۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے مجھے یہ چند سطریں لکھیں۔

پیارے عبادت!

زندہ ہوں۔

میں بھی تمہارا عجیب مہمان ہوں۔

بہر حال اس وقت حامل رقعہ کے ہاتھ ہمارا ایک کرتہ اور پاجامہ جو کہ ہمارے بستر بند میں اوپر ہی ایک کپڑے میں لپٹا ہوا ہے، بھیج دو۔

کل ملیں گے اور رخصت ہوں گے۔ مجاز"

میں نے ان کے ارشاد کی تعمیل تو کر دی، لیکن ساتھ ہی لکھ بھیجا، "تم بڑے نالائق ہو۔ تم نے مجھے بھی پریشان کیا اور جوش صاحب کو بھی تکلیف پہنچائی۔ آخر لاابالی پن کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔"

لکھنے کو تو یہ سب کچھ لکھ دیا، لیکن مجھے ان کے اس لاابالی پن پر کوئی تعجب نہیں تھا۔ یہ تو بڑی معمولی سی بات تھی۔ میں نے تو انہیں اس سے بھی زیادہ عجیب حرکتیں کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ یہ حضرت لکھنؤ سے دِلّی صرف شراب پینے

کی غرض سے آئے ہیں۔ لکھنؤ میں تو انصار ہاروانی نے ان پہ احتساب کر رکھا تھا اور انصار سے یہ ڈرتے بھی تھے۔ اسی لیے تنگ آ کر دلّی کی طرف بھاگے ہیں اور میرا یہ خیال سو فی صد صحیح نکلا۔

یہ لاابالی پن اور بے راہ روی مجاز کی شخصیت میں بہت نمایاں تھی۔ وہ اسی سے پہچانے جاتے تھے، لیکن ان کے جاننے والے جانتے ہیں کہ وہ صرف لاابالی آدمی ہی نہیں تھے۔ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ تھے۔ وہ بڑے ہی شریف آدمی تھے۔ نیکی اور سیدھے پن کی خصوصیت بقول شخصے ان کی گھُٹّی میں پڑی تھی۔ انہیں کسی شخص سے بگڑنا اور ناراض ہونا نہیں آتا تھا۔ وہ کسی کے ساتھ بُرائی نہیں کر سکتے تھے۔ کسی کی بہتری کے سوا کوئی اور بات ان کے ذہن میں آتی ہی نہیں تھی۔ کسی سے بُرائی کرنا یا انتقام لینا تو وہ جانتے ہی نہیں تھے۔ ان کی شخصیت میں شرافت ہی شرافت تھی۔ ان کا خلوص بے پایاں تھا۔ ان کی محبت بے اندازہ تھی۔ وہ کسی کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ان کی دوستی پر بھروسہ کیا جا سکتا تھا اور اس میں شک نہیں کہ وہ بہت ہی اچھے دوست تھے۔ انہوں نے کبھی کسی کو دھوکا نہیں دیا۔ کبھی کوئی چھچھوری بات نہیں کی۔ نشے کی اور بات ہے لیکن ہوش کے عالم میں کبھی انہیں شرافت کے دائرے سے باہر نکلتے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ کبھی نیچے نہیں گرے۔ انہوں نے کبھی کسی کی خوشامد نہیں کی کبھی کسی کو بے جا طور پر نہیں سراہا۔ انہیں تکلّف اور بناوٹ سے نفرت تھی۔ وہ جو کچھ تھے وہی اپنے آپ کو ظاہر کرتے تھے۔ انہیں شہرت کی خواہش نہیں تھی۔ ناموری کی پروا نہیں تھی۔ وہ ہر چیز سے بے نیاز تھے۔ انہیں ہمیشہ خیر کا خیال رہتا تھا۔ شر کے تو وہ پاس بھی نہیں پھٹکتے تھے۔ بُرائی کا تو انہیں خیال تک نہیں آتا تھا۔ وہ تو ایک رند پاکباز تھے اور رندی کی تمام خصوصیات ان کے اندر موجود تھیں۔

یہ رندی مجاز کے مزاج میں داخل تھی اور اسی رندی کا یہ نتیجہ تھا کہ وہ لاابالی مزاج کے مالک تھے۔ ان کی طبیعت میں بے راہ روی تھی۔ باقاعدگی کی کسی قدغن کو وہ اپنے لیے ضروری

نہیں سمجھتے ہے۔ اور اس سلسلے میں انہیں خود اپنے اوپر قابو نہیں تھا۔ بعض معاملات میں تو وہ بالکل ہی بے بس تھے۔ اور یہ خصوصیات درحقیقت ایک ،جینیئس، کی خصوصیات تھیں۔ جینیئس میں کسی نہ کسی طرح کی بے راہ روی، کسی نہ کسی نوعیت کی بے قاعدگی ہوتی ضرور ہے۔ مجاز بھی ایک "جینس" تھے اور اسی لیے یہ بے قاعدگی اور بے راہ روی کی خصوصیات ان کے یہاں بھی پائی جاتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں ان مذموات کا شکار دیکھ کر ہمیشہ محبت اور ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوتا تھا۔

مجھے تو ان کی باتوں پر ہمیشہ پیار آیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ وہ پیار کرنے کی ہی چیز تھے۔

مجاز کی زندگی کے اس لاابالی پن میں بھی ایک معصومیت اور سادگی تھی۔ وہ کبھی اوباشی کے نتیجے میں پیدا نہیں ہوئی تھی۔ مجاز کی حالت اس معاملے میں بالکل اس معصوم بچے کی سی تھی جو نتائج کو سمجھے بغیر بعض ایسی حرکتیں بھی کرتا ہے جن سے سوائے نقصان کے کبھی کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اور اس کو نہ روکا جائے تو یہ حرکتیں اس کی زندگی بن جاتی ہیں۔ مجاز بھی ساری زندگی کچھ ایسی ہی صورت حال سے دوچار رہے۔

البتہ مجاز کی زندگی کے اس پہلو کو لوگ اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے تھے، اور دیکھنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ عزیز اور دوست سب ان سے نالاں تھے۔ لیکن کبھی کسی نے یہ غور نہیں کیا کہ اس شخص کی زندگی میں محرومیوں اور ناکامیوں نے کتنے بڑے خلا کو پیدا کیا تھا۔ اور مجاز کی یہ حرکتیں درحقیقت اس خلا کو پر کرنے کی ایک غیر شعوری کوشش تھی اور پھر کون سا جینئس ایسا گذرا ہے جو اس قسم کی بے راہ روی کا شکار نہ ہو۔

ایسا کیوں ہوتا ہے؟

جینئس، میں باقاعدگی کیوں نہیں ہوتی؟

وہ زندگی کے مروّجہ نظام اقدار سے بغاوت کیوں کرتا ہے؟

اس کو سکون کیوں نہیں ملتا؟

اس کی زندگی میں ہنگامے کیوں ہوتے ہیں ؟

وہ کسی کی پروا کیوں نہیں کرتا ؟

کسی کی بات کیوں نہیں مانتا ؟

اپنی موت کو کیوں دعوت دیتا ہے ؟

مجاز کی شخصیت کو دیکھ کر یہ اور اس قسم کے ان گنت سوالات ہمیشہ میرے ذہن میں ابھرے ہیں۔ لیکن میں انہیں حل نہیں کر پایا ہوں۔ یہ باتیں آج بھی میرے لیے معمہ ہیں۔

مجاز ایک جینئس تھے۔ اس لیے ان کی زندگی میں یہ بے راہ روی ایسی کچھ عجیب نہیں معلوم ہوتی۔ اس پر افسوس ہوتا ہے، لیکن ان کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ مجاز کی اس بے راہ روی میں بڑی انسانیت تھی۔ انسان ہر اعتبار سے مکمل نہیں ہوتا۔ اس میں کمزوریاں بھی ہوتی ہیں اور یہ کمزوریاں مجاز میں بھی تھیں۔ اور ان کی بے راہ روی درحقیقت انہیں انسانی کمزوریوں کا مظہر تھی۔ اس لیے میں تو ان کی اس بے راہ روی کو ہمیشہ نظر انداز کرنے کے لیے مجبور ہو گیا ہوں۔ کیونکہ میں نے خود انہیں اس معاملے میں مجبور پایا ہے۔ کوئی ان دیکھی طاقت ان سے وہ سب کچھ کرواتی تھی جو وہ خود کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اس لیے ان کی بے قاعدگی اور بے راہ روی کو دیکھ کر ان پر ترس آتا تھا، اور ان سے ہمدردی کرنے کو جی چاہتا تھا۔ کتنی بار ایسا ہوا کہ انہیں برے حال میں دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مجھ پر رقت طاری ہو گئی۔ خصوصاً اس وقت جب میں نے دیکھا کہ ان کی انسانیت اور شرافت اس مدہوشی کے عالم میں بھی برابر چھپ چھپ کر اپنے آپ کو نمایاں کرتی رہتی ہے۔

اور اس شرافت کا مظاہرہ وہ ہر وقت اپنی حرکات و سکنات سے کرتے رہتے تھے۔ انہیں اپنی خاندانی شرافت کا بڑا خیال تھا۔ وہ اپنے بزرگوں کی عزت کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ سچ بولتے اور سچ بات کے لیے جان کی بازی تک لگا دینے کو تیار رہتے تھے۔ دل کی بات کو دل کے اندر رکھنے کے قائل نہیں تھے۔ جو کچھ ان کے دل میں

ہوتا وہ زبان پر آجاتا تھا۔ وہ بڑے ہی غیور اور بے باک تھے۔ انہیں کسی سے دبنا اور کسی کی خوشامد کرنا نہیں آتا تھا۔ وہ کسی قسم کی غلط بات کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ ان کی آواز ہمیشہ حق کی آواز ہوتی تھی۔ کسی کی تکلیف کو دیکھ کر ان کا کلیجہ منہ کو آنے لگتا تھا۔ اور وہ بہت جلد بے چین ہو جاتے تھے۔ مجھے مجاز کی زندگی کے ایسے بے شمار واقعات کا علم ہے جو ان کی شخصیت کی ان خصوصیات کو واضح کرتے ہیں۔

مجاز یوں تو رند لاابالی تھے لیکن اپنے بزرگوں کے سامنے ان کی رندی بھی ختم ہو جاتی تھی۔ لاابالی پن بھی جواب دے دیتا تھا۔ مجاز کو شراب کی بری عادت طالب علمی کے زمانے ہی میں پڑ گئی تھی، لیکن ایک زمانے تک انہوں نے اپنے والدین اور دوسرے بزرگوں سے اس بات کو چھپائے رکھنے کی کامیاب کوشش کی۔ ظاہر ہے اس بات کو وہ کب تک چھپا سکتے تھے۔ بالآخر ان کے گھر والوں کو اس کا علم ہو گیا لیکن اس کے باوجود مجاز یہ ظاہر کرتے تھے کہ وہ اس بری عادت کا شکار نہیں ہیں بلکہ جن لوگوں نے بھی ان کے والدین کو اس طرف متوجہ کیا، ان سے وہ خفا ہو جاتے تھے۔ حالانکہ ویسے انہیں خفا ہونا نہیں آتا تھا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ شوکت تھانوی نے مجاز کے والد صاحب سے مجاز کا ذکر کرتے ہوئے بہت سی تعریفوں کے بعد آخر میں یہ کہہ دیا کہ مجاز کو شراب نوشی کی عادت پڑ گئی ہے، کسی طرح اسے چھڑایئے۔

یہ خبر مجاز تک بھی پہنچی، بہت خفا ہوئے اکثر دوستوں سے شوکت صاحب کی شکایت کی اور کہا۔

"میں نے شوکت صاحب سے کہہ دیا ہے کہ وہ یا تو میرے والد صاحب سے دوستی رکھیں یا مجھ سے۔ بہ یک وقت باپ بیٹے دونوں سے دوستی مناسب نہیں۔"

شوکت صاحب نے تو حقیقت کا اظہار کیا تھا۔ مجاز اس پر خفا نہ ہوئے۔ خفا ہونے کی وجہ یہ تھی کہ ان کی شراب نوشی کا ذکر ان کے گھر والوں سے کیا گیا تھا۔ اور وہ یہ جانتے

ہوئے کہ ان کے گھر والوں کو ان کی شراب نوشی کا علم ہے، انہیں چاہتے تھے کہ اس بُرے کام کا تذکرہ ان لوگوں سے کیا جائے۔

یوں بظاہر دیکھنے میں یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ مجاز کی ایک گھریلو زندگی بھی ہے۔ کیونکہ وہ ہمیشہ گھر سے باہر ہنگامے کرتے رہتے تھے۔ لیکن ان کی ایک گھریلو زندگی بھی تھی۔ وہ گھر کے معاملات میں گہری دلچسپی لیتے تھے۔ خاندان کے ہر فرد کا حتی الامکان خیال رکھنے کی کوشش کرتے۔ والدین اور بھائی بہنوں سے تو انہیں والہانہ محبت تھی۔ خاصا وقت وہ گھر میں گذارتے تھے۔ کبھی کہیں سے کچھ آمدنی ہو جاتی تو ضرور کچھ نہ کچھ چیزیں گھر والوں کے لیے خرید کر لے جاتے بے ہوشی کے عالم میں بھی انہیں اس بات کا ہوش رہتا تھا۔ اپنے چھوٹوں کا انہیں بڑا پاس لحاظ رہتا تھا۔ انصار اور صفیہ کا وہ کہنا مانتے تھے۔ انصار ہی کے کہنے سے وہ کبھی کبھی شراب چھوڑ دیتے تھے۔ بلکہ انصار سے تو وہ ڈرتے بھی تھے۔ اس سے تو ان کی روح قبض ہوتی تھی۔ اس لیے نہیں کہ وہ ان پر سختی کرتا تھا بلکہ اس لیے کہ اس کی بات کو رد کرنے کی سکت ان میں نہیں تھی۔

مجاز نے جم کر کبھی کوئی ملازمت نہیں کی۔ اس میں ان کی طبیعت کے انتشار، مزاج کے تلوّن، رندی اور لاابالی پن کو ہی دخل نہ تھا۔ آزادی کا خیال اور خودداری کا احساس بھی اس میں شامل تھا۔ اسی لیے وہ ملازمت کو ہمیشہ بُرا بھلا کہتے کیونکہ ان کے خیال میں ملازم آدمی کو دوسرے کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ اس کی انفرادیت ختم ہو جاتی ہے۔ خودداری پر زخم کاری لگتا ہے اور انسان اس طرح کسی کام کا باقی نہیں رہتا۔ پھر یہ بھی ہے کہ اپنے مزاج کے خلاف باتیں کرنی پڑتی ہیں۔ بے جا خوشامد کرنی پڑتی ہے۔ خوامخواہ ہاں میں ہاں ملانی پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ساری زندگی عسرت اور پریشانی کے عالم میں رہے، لیکن ملازمت کو زندگی کے لیے ایک لعنت ہی سمجھا اور اس لئے اس سے دور بھاگتے رہے، لیکن کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ ان کی غیرت مندی کا یہ ادنیٰ ثبوت ہے۔

مجاز کی بے باکی اور صاف گوئی بھی ان کی شخصیت کا نمایاں وصف ہے۔ وہ

کسی کی لگی لپٹی نہیں رکھتے تھے۔ غالباً جنگ کے زمانے کی بات ہے جب اُردو کے بعض شاعروں نے حکومت کی ملازمت کر لی تھی اور اس طرح شاعر سے افسر ہو گئے تھے انہیں دنوں دِلّی ریڈیو پر ایک مشاعرہ ترتیب دیا گیا۔ اس مشاعرے کی صدارت ڈاکٹر تاثیر مرحوم نے کی تھی اور اس میں فیض (جو اس زمانے میں لفٹیننٹ کرنل یا کرنل ہو گئے تھے) اور بعض دوسرے شعراء بھی شریک تھے، مجاز کا قیام ان دنوں دلّی میں تھا۔ انہیں بھی مشاعرے میں شرکت کی دعوت دی گئی۔

مجاز مشاعرے میں ذرا تاخیر سے پہنچے۔ بُری طرح نشے میں دُھت تھے۔ جب انہیں پڑھنے کے لیے طلب کیا گیا تو وہ اپنی جگہ سے جھومتے جھامتے اٹھے اور اپنی نظم یا غزل پڑھنے سے قبل یہ شعر پڑھنا شروع کر دیا۔

شاعر ہوں اور امین ہوں عروسِ سخن کا میں
کرنل نہیں ہوں خاں بہادر نہیں ہوں میں

لیکن مجاز کی آواز یہ شعر پڑھتے پڑھتے ڈوب گئی۔ ریڈیو بند کر دیا گیا۔ اس زمانے میں تو یہ حکومت کی توہین تھی۔ خان بہادر اور کرنل قسم کے شاعر تو خیر اس پر کچھ زیادہ جِز بِز نہ ہوئے، لیکن ریڈیو کے محکمے میں ایک ہنگامہ بپا ہو گیا۔ کئی دن تک کھچڑی پکتی رہی اور آخر یہ نتیجہ نکلا کہ ریڈیو پر مجاز کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا گیا۔

لیکن مجاز ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کی کب پروا کرتے تھے۔ منہ تک آئی ہوئی بات ان سے رُکتی نہ تھی۔ نشے کے عالم میں بھی انہیں اس بات کا خیال رہتا تھا اور وہ بے باکی سے اس کا اظہار کر دیتے تھے۔

انگریزوں کی بدیسی حکومت کی ملازمت ان کے نزدیک لعنت تھی۔ حکومت کی پرورش کو وہ شاعر کی توہین سمجھتے تھے۔ جنگ کے زمانے میں انگریزوں کی حکومت یہ ہتھکنڈے استعمال کر رہی تھی اور اس نے بہت سے شاعروں اور ادیبوں کو خرید لیا تھا۔ مجاز اس کو بُری نظر سے دیکھتے تھے اور اس کے اظہار میں انہیں ذرا بھی تامل نہیں ہوتا تھا۔

ریڈیو کی محفل مشاعرہ تک اس سے نہیں بچ سکتی تھی۔ کرنلوں اور خان بہادروں کے سامنے بھی وہ بے باکی کے ساتھ اس رائے کو ظاہر کرنے سے نہیں جھجکتے تھے۔

اور یہ سب کچھ اس لیے تھا کہ مجاز کو انسان عزیز تھا۔ انسان کی انسانیت عزیز تھی، انسان کی عزّت عزیز تھی، انسانیت کی بنیادی قدریں عزیز تھیں، اور چونکہ انسان کو وہ بہت عزیز سمجھتے تھے، اس لیے اس کی توہین ان سے برداشت نہ ہوتی تھی۔ چنانچہ جب بھی وہ انسانیت کی قدروں کو گھائل ہوتا ہوا دیکھتے تھے تو ان کا پارہ چڑھ جاتا تھا اور وہ کسی کو بھی بخشتے نہیں تھے۔ انہیں انسانوں سے دلچسپی تھی۔ ایسے انسانوں سے جو صحیح معنوں میں انسان ہوں، جنہیں انسانیت کی قدریں عزیز ہوں اور یہ خوبیاں انہیں ملمع کیے ہوئے انسانوں سے کہیں زیادہ ان عام انسانوں میں نظر آتی تھیں جو نام نہاد تہذیب سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔

دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ انہیں عوام سے دلچسپی اور ہمدردی تھی اور وہ انہیں کو انسانیت اور انسانی قدروں کا علم بردار سمجھتے تھے۔ اس لیے مزدوروں اور کسانوں کی تکلیف ان سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔

مجاز کو ان باتوں نے اشتراکیت کے قریب کیا اور اس میں شک نہیں کہ وہ نظریاتی طور پر سچّے اشتراکی تھے۔ یہ صحیح ہے کہ انہوں نے اشتراکی فکر و فلسفہ کا گہرا مطالعہ نہیں کیا تھا لیکن نظام اقدار کی ناہمواری کے شدید احساس نے مجاز کو اشتراکی بنا دیا تھا۔ اس احساس نے ان پر یہ حقیقت روشن کر دی تھی کہ انسانیت کا مداوا یہی اشتراکی نظام ہے۔ اس کے مسائل اسی نظام کے سہارے حل ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ مجاز نے اشتراکی نظام کے قیام کو ضروری سمجھا ہے اور اس طرف توجہ بھی دلائی ہے۔ اس کا پیام بھی دیا ہے لیکن وہ اس منزل تک جذبات کے راستے ہی سے پہنچتے ہیں۔ عقل و شعور کی کارفرمائی اس میں کم نظر آتی ہے۔ علمی اور حکیمانہ زاویۂ نظر کا احساس بھی ان کے یہاں نہیں ہوتا، لیکن اس سے ان کے اشتراکی نظریے کو ٹھیس نہیں لگتی۔ کیونکہ ان کی ذہانت

ان باتوں کے بغیر بھی انہیں صحیح قسم کا اشتراکی بنا دیتی ہے۔

ایک اشتراکیت کی علمیت تو بے شک ان کے ہاں نہیں تھی، لیکن ویسے جہاں تک سوچنے کا تعلق ہے وہ اشتراکی نقطۂ نظر سے سوچتے تھے۔ انہیں سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام سے نفرت تھی۔ اُمراء اور روساسے نفرت تھی۔ مزدوروں سے وہ زیادہ قریب تھے۔ عوام سے انہیں زیادہ لگاؤ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے لوگوں میں انہیں بٹھا دیا جائے تو وہ پریشان ہو جاتے تھے۔ ایسے ماحول میں ہمیشہ ان کا دم گھٹتا تھا۔ اور وہ ہمیشہ ان سے بچنے کی کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ جب اس موضوع پر بحث کرتے تو ان کی بے ربط باتوں میں بھی محسوس ہوتا تھا جیسے وہ مارکسی فلسفے کے اسرار و رموز کو صحیح طور پر پیش کر رہے ہیں۔

مارکسیت سے ان کی یہ دلچسپی صرف جذباتی ہی نہیں تھی وہ ذہنی طور پر بھی اشتراکی تھے۔ ہر چند کہ انھوں نے اشتراکی نظریات کا گہرا مطالعہ نہیں کیا لیکن چونکہ اشتراکی نظریات سے وہ ایک طبعی مناسبت رکھتے تھے اس لیے اس کے بنیادی اصولوں سے انھوں نے واقفیت حاصل کر لی تھی، اور پھر اپنی خداداد ذہانت سے وہ ان اصولوں اور نظریات کی روشنی میں زندگی کے ہر پہلو کو کچھ اس طرح دیکھتے تھے کہ نتائج صحیح نکلتے تھے۔

لیکن جہاں تک ان اصولوں اور نظریات کے برتنے کا تعلق ہے وہ اس میں انتہا پسند نہیں تھے۔ خصوصاً شعروادب کے معاملے میں ان کا یہ تصور نہیں تھا کہ کوئی بات ایسی کہی ہی نہ جائے جو اشتراکیت کے خلاف ہو۔ اس معاملے میں وہ خاصے کشادہ دل اور روشن دماغ تھے۔ وہ شاعر کو شاعر پہلے سمجھتے تھے۔ چنانچہ جنگ کے زمانے میں خالص اشتراکی نقاد ان پر اعتراض کرتے تو مذاق میں ہمیشہ یہ کہتے۔

"جی ہاں، یہ نظم ذرا پٹری سے اتر گئی ہے"

حالانکہ ان کی نظمیں یوں پٹری سے کم ہی اُترا کرتی تھیں۔ لیکن خالص اشتراکی نقاد یہ سمجھتے ضرور تھے کہ وہ پٹری سے اتری ہوئی ہیں۔ لیکن مجاز نے کبھی ان باتوں کی پروا نہیں کی۔ وہ جو کچھ خود صحیح سمجھتے تھے، وہی کرتے تھے۔ میکانکی انداز ان کے تخلیقی مزاج اور فنکارانہ

ذہن کو ڈانواڈول نہیں کر سکتا تھا۔

مجاز صحیح معنوں میں ایک تخلیقی فن کار اور شاعر تھے۔ ایک تخلیقی فن کار اور شاعر کو فکر و خیال کی جو آزادیاں ہونی چاہئیں وہ مجاز کو بہت عزیز تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ میکانکی نقادوں کی ہر بات ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے، بلکہ ہمیشہ ان کی باتوں کا مذاق اڑاتے تھے۔ ان کے خیال میں شاعر کا اپنا زاویۂ نظر ہوتا ہے۔ وہ لکیر کا فقیر نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ خود ان کی شاعری میں جدت اور اچھوتے پن کا احساس ہوتا ہے اور اس جدّت اور اچھوتے پن کو پیدا کرنے میں ان کی ذہانت اور خوش طبعی کو بڑا دخل ہے۔ اچھوتے پن کے بغیر ان کی کوئی بات ہوتی ہی نہیں تھی۔ یہی خصوصیت ان کی شاعری میں بھی سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے۔

نہ صرف شاعری، بلکہ ان کی ایک ایک بات سے یہ اچھوتا پن ٹپکتا تھا۔ وہ ہر بات میں کوئی نہ کوئی فقرہ کہتے، کوئی نہ کوئی لطیفہ تراشتے تھے اور اس فقرے اور لطیفے میں بڑی ہی لطافت ہوتی تھی۔ بلا کی نفاست کا احساس ہوتا تھا۔ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ فقرے اور لطیفے اکثر مبتذل ہو جاتے ہیں لیکن مجاز کو میں نے کبھی مبتذل ہوتے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ اس فقرے اور لطیفے میں بات کی تہہ تک پہنچتے ہوئے معلوم ہوتے تھے اور در حقیقت لطیفے اور فقرے سے یہی ان کا مقصد ہوتا تھا۔ لیکن ان میں سب سے زیادہ ان کی شگفتگی و ظرافت برجستگی اور لطافت اپنی طرف متوجہ کرتی تھی۔

یہی وجہ ہے کہ مجاز ان فقروں اور لطیفوں سے روتوں کو ہنسا سکتے تھے۔ بزم ماتم کو محفل نشاط بنا سکتے تھے۔ اور مجاز کے یہ فقرے دو چار نہیں ہیں۔ دس بیس نہیں ہیں۔ بلکہ اگر جمع کیے جائیں تو ان کی تعداد سینکڑوں تک ضرور پہنچ سکتی ہے۔ کیونکہ مجاز کی تو ہر بات میں لطیفے کا پہلو ہوتا تھا۔ چھوٹی سے چھوٹی اور معمولی سے معمولی بات بھی، جب مجاز کی زبان سے ادا ہوتی تو اس میں ایک دل موہ لینے والا انداز پیدا ہو جاتا تھا۔ مثلاً وہ بات... ایک معمولی ہی سی بات تو تھی جو موٹر کار دیکھ کر ان کے ہونٹوں پہ آجاتی تھی۔

موٹر کو دیکھ کر وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے۔ "یار! یہ موٹر زن سے ہمارے پاس سے اس طرح گزر جاتی ہے، یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم پر طنز کر رہی ہے"۔

یا پھر شادی کے بارے میں ان کا یہ فقرہ کہ "بھئی شادی تو ٹھیک ہے، لیکن اس کے بعد وہ جو ایک وادی ہوتی ہے، وہ اچھی خاصی مصیبت ہے۔ آدمی گھن چکر ہو کر رہ جاتا ہے گھن چکر"۔

اسی طرح مجاز کا ایک اور فقرہ بھی بہت دلچسپ ہے۔ ایک صاحب کی پہلی بیوی کا انتقال ہو گیا تھا اور وہ دوسری شادی کی فکر میں تھے۔ احباب ان سے پوچھ رہے تھے "آخر اس میں تاخیر کیوں ہو رہی ہے؟"

اس پر وہ صاحب بولے "صاحب! میں کسی بیوہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور بیوہ ابھی تک کوئی ملی نہیں"۔

مجاز یہ سنتے ہی بول اٹھے "صاحب! اس میں کون سی قباحت ہے، آپ شادی کر لیجئے وہ خود ہی بیوہ ہو جائے گی"۔

پاکستان بننے کے بعد مجاز مشاعرے میں شرکت کی غرض سے لاہور اور کراچی آئے۔ کچھ عرصے قیام کے بعد لکھنؤ واپس پہنچے تو پاکستان کی بہت سی باتیں کیں اور آخر میں کہنے لگے۔

"پاکستان بننے سے مجھے بہت فائدہ ہوا ہے۔ میری اہمیت بہت بڑھ گئی ہے"۔

میں نے کہا "وہ کیسے؟"

کہنے لگے "میں فارین کنٹری کی سیر کر کے آ رہا ہوں اور اب میں بھی فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے بھی ایک فارین کنٹری دیکھا ہے"۔

غرض اس قسم کے ان گنت لطیفے اور فقرے مجاز نے ہمیں دیے۔ وہ ایک باغ و بہار آدمی تھے۔ اور ہر لمحہ ان لطیفوں اور فقروں کے پھول بکھیرتے رہتے تھے۔ انہیں جمع کر کے

محفوظ رکھنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ وہ ایک ایسے انسان کی تخلیق ہیں جو اس فن میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔

مجاز یوں تو ایک باغ و بہار قسم کے آدمی تھے، لیکن ویسے ان کی زندگی ایک بہت بڑا المیہ تھی۔ زندگی کو انہوں نے بہت کچھ دیا لیکن وہ خود زندگی سے محروم رہے۔ کہنے کو تو وہ زندہ تھے لیکن ان کی زندگی کے انداز کو دیکھ کر ہمیشہ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ زندگی سے تنگ آکر اور پریشان ہو کر موت کی طرف بھاگ رہے ہیں۔ چنانچہ میں نے انہیں دیکھ کر ہمیشہ یہ محسوس کیا کہ وہ وقت ... کے ساتھ ساتھ اس چراغ کی طرح بجھتے جا رہے ہیں جس میں تیل باقی نہیں رہتا۔ اُن کی شگفتگی بھی وقت کے ساتھ ساتھ ختم ہوتی جا رہی تھی۔

مگر گذشتہ سال جب میں ان سے لکھنؤ میں ملا تو مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ہر وقت چہکنے والے اس باغ و بہار انسان کو چپ سی لگ گئی تھی۔ بہت کم باتیں کرتے تھے اور جب باتیں کرتے بھی تھے تو زندگی کی الجھنوں اور پریشانیوں کی باتیں کرتے تھے۔ اور زندگی کا رونا روتے تھے۔

میں کافی ہاؤس میں پہنچا تو دیکھا، ایک کونے میں بیٹھے ہیں۔ تین چار لڑکے ان کے آس پاس ضرور موجود ہیں۔ بڑے تپاک سے ملے۔ دیکھ کر دل کی کلی کھل گئی۔ بغل گیر ہوئے، اور پھر میں بھی اس میز پہ بیٹھ گیا، اور اس طرح ایک زمانے کے بعد ایک دفعہ پھر پرانی صحبتوں کی یاد تازہ ہوئی۔ لیکن میں نے ان کے اندر خاصا تغیّر محسوس کیا۔ اب وہ باتوں میں ہنستے نہیں تھے۔ فقرہ مشکل ہی سے ہوتا تھا۔ سنجیدگی کے عالم میں گفتگو ہوتی رہی۔ میں نے پُرانی صحبتوں کا ذکر کر کے ہنسنے ہنسانے کی کوشش کی لیکن وار خالی گیا۔

گفتگو اس دائرے سے باہر نہ نکل سکی۔

"بھئی عبادت! خوب آئے۔ لکھنؤ کب پہنچے؟"

"کل ہی آیا ہوں۔ لکھنؤ دیکھنے اور احباب سے ملنے کی خاطر آگیا۔ بہت جی چاہتا تھا۔"

"لکھنؤ اب کہاں؟"

"غزالانِ لکھنؤ کا کیا حال ہے؟

اب یہاں کوئی غزال نہیں۔ سب چلے گئے"

"پھر جی کس طرح لگتا ہے؟"

"وقت کاٹتے ہیں۔ مانوس صورتیں تک دیکھنے کو نہیں ملتیں"

"ماحول کو بدلنا ہی چاہیئے تھا"

"ہو، کا عالم ہے۔ ویرانی ہی ویرانی ہے۔ ایسا بھی ماحول کا بدلنا کیا ہوا!"

"وقت کس طرح گذرتا ہے؟"

"دن بھر گھر میں پڑے رہتے ہیں۔ شام کو ادھر آنکلتے ہیں"

"شعر و شاعری کا کیا حال ہے؟"

"بہت دنوں سے کچھ نہیں کہا۔ شعر اس ماحول میں کہاں ہوتا ہے؟"

"لاہور کیوں نہیں آتے؟"

"دل بُجھ گیا ہے۔ کہیں آنے جانے کو دل نہیں چاہتا"

"صحت کیسی ہے؟"

"بس جی رہے ہیں"

غرض کوئی ڈیڑھ گھنٹے تک کچھ اس طرح کی گفتگو کے بعد ہم وہاں سے اُٹھے۔ مجاز کو اتنا سنجیدہ میں نے کبھی نہیں پایا۔ اس درجہ قنوطیت کا شکار کبھی نہیں دیکھا۔ وہ بالکل بُجھ گئے تھے۔ ان میں کوئی شگفتگی باقی نہیں رہی تھی۔ بات کرنے میں بھی انہیں تکلّف ہوتا تھا۔ بات کیجئے تو جواب دے دیتے تھے۔ ورنہ محسوس تو یہ ہوتا تھا جیسے ان میں بات کرنے کی سکت ہی نہیں رہی۔ وہ بول سکتے ہی نہیں۔

انہیں اس عالم میں دیکھ کر یہ محسوس ہوا کہ اب ان کا غم پھیل کر بیکراں ہو گیا ہے۔ اور وہ اس میں ڈوب گئے ہیں۔ انہیں اپنے گرد و پیش سے کوئی دلچسپی نہیں رہی ہے۔

ان کے خلوص میں کمی نہیں ہوئی تھی لیکن اس خلوص کا اظہار جس طرح وہ کیا کرتے تھے اس طرح اب ان سے ممکن نہیں تھا۔ اب تو وہ صرف رونا ہی رو سکتے تھے۔ چنانچہ وہ دیر تک زندگی کے ناسازگار حالات کا رونا روتے رہے۔

اور میں بُت بنا ہوا برابر یہ سوچتا رہا کہ وہ شخص جو کبھی مطرب بزم دلبراں اور شاعر شہر نگاراں تھا اور جس سے وابستہ ہونے کے لیے لوگ اپنی تنہائیوں میں، جھوٹ موٹ ہی سہی، محض دل بہلانے کی غرض سے حسن وجمال کے نہ جانے کتنے شاہکار قریئے نکال لیتے تھے، اس کو زمانے نے کس طرح ایک، شمع کُشتہ، بنادیا ہے۔

مجاز میں یہ حیرت انگیز اور افسوسناک تبدیلی دیکھ کر میرا ماتھا اسی وقت ٹھنکا تھا اور بہت سے بُرے اور بے تکے خیالات میرے ذہن میں آئے تھے۔ ایسے خیالات جنہیں میں ذہن میں لانا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن جن سے باوجود کوشش کے میں پیچھا نہ چھڑا سکا۔

اور پھر یہ تمام خیالات ایک دِن حقیقت بن گئے۔ جب کسی نے لاہور میں ٹیلی فون پر یہ خبر سنائی کہ مجاز اس دنیا سے منہ موڑ کر ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے۔

پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ لیکن مجھے اس پر تعجب نہیں ہوا۔ کیونکہ یہ تو مجھے برسوں سے معلوم تھا کہ مجاز مرنے کی آرزو میں مرتے ہیں۔ ان کی یہ آرزو پوری ہو گئی۔ شاید اب انہیں سکون مِل گیا ہو گا۔

لیکن کون جانے کہ اب بھی انہیں سکون ملا ہے یا نہیں!۔

میراجی

"میراجی کتنا عجیب نام تھا!

جب بھی میں میراجی کا نام سُنتا تو میرے سامنے میراں جی شمس المشتاق آجاتے جو بڑے پہنچے ہوئے بزرگ تھے۔ اور جو ہماری زبان میں اپنے ترجمہ شرح مرغوب القلوب کے لیے مشہور ہیں۔ میں سوچتا میراجی ضرور کوئی پہنچے ہوئے آدمی ہوں گے اور کوئی نہ کوئی نسبت انہیں میراں جی شمس المشتاق یا اسی قسم کے کسی بزرگ اور صوفی صافی سے ضرور ہوگی۔ ورنہ وہ اتنا عجیب نام کیوں رکھتے۔ لیکن ان کی بعض نظمیں دیکھنے کے بعد اندازہ ہوا کہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ میراجی صوفی نہیں۔ پہنچے ہوئے آدمی نہیں۔ اللہ والے نہیں۔ اسی دنیا کے انسان ہیں۔ اسی دنیا میں رہتے ہیں۔ اسی دنیا میں وہ ان تمام راہوں سے گزرے ہیں جن سے ایک انسان گزر سکتا ہے۔ ان کی زندگی میں بھی وہ منزلیں آئی ہیں، جو ہر انسان کی زندگی میں آتی ہیں، یا آسکتی ہیں۔ ان کے یہاں زندگی کا احساس شدید ہے۔ انہوں نے اس کے مختلف پہلوؤں کو بہت قریب سے دیکھا ہے، اس کی ایک ایک چیز، ایک ایک پہلو میں حسن ہے، لطافت ہے، رنگینی ہے، رعنائی ہے اور اس کے علاوہ بھی نہ جانے کیا کیا کچھ ہے۔ وہ اس دھرتی کو چھوڑ کر آسمانوں پر بسیرا لینے کے قائل نہیں بلکہ یہ دھرتی ہی ان کے لیے سب کچھ ہے۔ اور وہ ان سب سے رس نچوڑ لینے ہی کو اپنا مسلک سمجھتے ہیں۔ ان کی نظموں کو پڑھنے کے بعد تو یہی احساس ہوتا تھا لیکن ان کا نام تو میراجی

تھا، اور ان کا نام سنتے ہی میراجی شمس العشاق کی بزرگی اور تقدس کی خصوصیات ضرور میرے ذہن میں منڈلانے لگتی تھیں اور رہ رہ کر یہ خیال آتا تھا کہ بہت ممکن ہے ان کا تعلق تصوف سے ہو اور وہ ایک پہنچے ہوئے بزرگ ہوں یہ کتنا عجیب تضاد تھا میرے ذہن میں میراجی کی شخصیت کے بارے میں!۔

میں اسی اودھیڑ بن میں رہتا کہ آخر میراجی ہیں کیا؟ لیکن یہ عقدہ حل نہ ہوتا، جتنے منہ اتنی ہی باتیں۔ کوئی کہتا، وہ عجیب و غریب شخصیت کے مالک ہیں۔ کبھی یہ بات مشہور ہو جاتی کہ ان کی ہیئت عجیب و غریب ہے۔ یعنی یہ کہ وہ فقیروں کی سی صورت بنائے رہتے ہیں۔ ان کے بال بڑے بڑے ہیں۔ ان کے جسم پر گیروے رنگ کا لباس رہتا ہے۔ وہ ہاتھوں میں دو گولے رکھتے ہیں۔ وہ پیدل بہت چلتے ہیں۔ انہوں نے بہت پڑھا ہے۔ وہ سنسکرت جانتے ہیں۔ انہیں ہندو کلچر سے بڑی دلچسپی ہے۔ وہ ایک بہت بڑے عالم ہیں انہوں نے دنیا کے مختلف ملکوں کے ادبیات کا مطالعہ کیا ہے۔ وہ بہت اچھے دوست ہیں۔ وہ بہت ہی بُرے آدمی ہیں۔ انہیں کسی لڑکی سے محبت ہے۔ انہیں بہت سی لڑکیوں سے محبت ہے۔ وہ بڑے حسن پرست ہیں۔ وہ بہت آوارہ ہیں۔ وہ کوئی بات چھپاتے نہیں بلکہ سب کچھ کہہ دیتے ہیں۔ وہ ہندو ہیں۔ نہیں وہ مسلمان ہیں لیکن مذہبی آدمی نہیں ہیں۔ وہ تو ایک سیدھے سادھے انسان ہیں۔ وہ ترقی پسند ہیں، انہیں وہ رجعت پسند ہیں۔ انہیں ایک جگہ پر قرار نہیں۔ وہ جہاں گشت ہیں۔ خانہ بدوش ہیں۔ صحرا نورد ہیں۔ ان کا رنگ گورا ہے، نہیں وہ سیاہ فام ہیں۔ ان کا قد چھ فٹ سے کم نہیں۔ نہیں وہ پستہ قد آدمی ہیں۔ ان کی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی ہیں۔ ان کی ناک اوپر کو اُبھری ہوئی ہے۔ ان کی پیشانی کشادہ ہے۔ ان کا سینہ چوڑا ہے۔ وہ دیکھنے سے مضبوط آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ نہیں ان کی صحت اچھی نہیں ہے۔ وہ بیمار ہیں انہیں بہت سے امراض نے گھیر رکھا ہے۔ غرض یہ کہ نہ جانے کتنی مختلف اور متضاد باتیں میراجی کی شخصیت کے متعلق ہوتیں لیکن اس حقیقت کا پتہ نہ چلتا کہ واقعی وہ ہیں کیا؟ اور ہر مہینے ان کی ایک نہ ایک نظم یا

ایک نہ ایک مضمون اپنے ساتھ ایک ہنگامہ لے کر آتا۔ میراجی ان دنوں بہت تیزی سے لکھ رہے تھے۔ اور ہمارے ایسے جدید ادب کے طالب علم انہیں باقاعدگی سے پڑھ رہے تھے۔

ان دنوں میں لکھنؤ یونیورسٹی میں پڑھتا تھا اور یونیورسٹی میں چند ایسے ادیبوں کا چھوٹا سا حلقہ تھا جو ادبیات کے جدید رجحانات اور خصوصاً اُردو ادب کے جدید رجحانات سے خاص دلچسپی رکھتے تھے۔ اس لیے جو بھی نیا نام سامنے آتا، جو بھی نئی تحریک نظر آتی، اس سے ہم لوگ خاصی دلچسپی لیتے۔ میراجی نئے تھے اس لیے بہت جلد انہوں نے ہم سب کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کر لیا۔ اب ہم ان کی نظموں پر آپس میں بحثیں کرتے۔ ان کی شخصیت اور کردار پر تبادلۂ خیال ہوتا۔ کوئی میراجی کی طرف سے آنکلتا تو اس کو گھیر لیتے۔ تاکہ ان کے متعلق کچھ معلومات حاصل ہوں۔ چنانچہ اسی طرح ہم لوگ میراجی سے واقف ہوئے، اور ہمیں ان کی شخصیت کا صحیح اندازہ ہوا۔ ورنہ اس سے قبل تو لوگ ان کے متعلق طرح طرح کی ایسی مختلف اور متضاد باتیں مشہور کر دیتے تھے جن سے ان کی شخصیت ایک معمّہ معلوم ہوتی تھی۔ معمہ تو خیر وہ کسی حد تک تھے بھی لیکن یہ باتیں اس معمے کو بھی ایک اور معمّہ بنا دیتی تھیں یہ وہ زمانہ تھا جب قدیم وجدید کی بحث نے ہمارے ادبی رسالوں نے بڑی شدت اختیار کر لی تھی اور جدت کا ہر مخالف میراجی کا نام لے کر عجیب عجیب باتیں کہتا تھا۔ ان عجیب و غریب باتوں کی نوعیت انفرادی اور شخصی بھی ہوتی تھی اور ادبی اور فنی بھی۔

شاید سب سے پہلے میراجی کے متعلق اس الجھن سے مجھے کرشن چندر یا شوامتر عادل نے نجات دلائی۔ لکھنؤ ریڈیو اسٹشن پر یوں ہی سلسلہ گفتگو چل نکلا تو انہوں نے میراجی کے متعلق یہ بتایا کہ میراجی کے بارے میں جو متضاد باتیں یہاں مشہور کی جا رہی ہیں وہ صحیح نہیں ہیں۔ میراجی کا اصلی نام ثناء اللہ خان ہے لیکن انہوں نے اپنا نام میراجی رکھ لیا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ انہیں میرا کا نام بہت پسند ہے۔ میرا کی شاعری کے بھی وہ والا وشیدا ہیں۔ اسی وجہ سے میرا کی شاعری کا جو موضوع ہے اس کے اثرات خود ان کی شاعری میں بھی نظر آتے ہیں۔ اور میرا اس لڑکی کا نام بھی ہے جس سے وہ محبت

کرتے ہیں۔ اسی لیے انہوں نے اپنا نام میراجی رکھ لیا ہے۔ اور وہ اسی نام سے لکھتے ہیں۔ ان کا اصلی نام بہت سے لوگ نہیں جانتے۔ ان کا قد درمیانہ ہے۔ ان کی آنکھیں بڑی بڑی ہیں۔ ان کی ناک ابھری ہوئی ہے۔ ان کے سر پر بڑے بڑے بال ہیں۔ کبھی کبھی وہ بال صاف کرا دیتے ہیں۔ ان کے چہرے کی خصوصیت ان کی مونچھیں بھی ہیں۔ ان کی باتوں سے بلا کی ذہانت ٹپکتی ہے۔ لیکن وہ باتیں کم کرتے ہیں اور جب باتیں کرتے ہیں تو بہت تیزی سے باتیں کرتے ہیں، جیسے انہیں کہیں بہت جلدی میں جانا ہو، یا جیسے وہ اس بات سے پیچھا چھڑا لینا چاہتے ہوں۔ وہ بعض عجیب عجیب حرکتیں کرتے ہیں۔ عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ ان کے ہاتھ میں پیتل کے دو گولے ہوتے ہیں اور ان گولوں کو وہ مسلتے رہتے ہیں۔ یہ ان کا عجیب و غریب مشغلہ ہے۔ وہ پڑھتے بہت ہیں، ان کا مطالعہ خاصا وسیع ہے۔ وہ کئی زبانیں جانتے ہیں۔ لیکن لاپروائی ان کے مزاج کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ چنانچہ اس خصوصیت کا اظہار ان کے افعال و کردار اور ہئیت و صورت سے ہوتا ہے۔ لباس کا وہ بہت کم خیال رکھتے ہیں۔ ان کی محبوب ترین چیزیں دو ہیں۔ ایک تو ان کی محبوبہ جس کے لیے وہ زمین کا گز بنے رہتے ہیں اور سڑکوں کو ناپتے پھرتے ہیں اور دوسرے حلقۂ ارباب ذوق جس کے لیے میراجی وہ سب کچھ کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس کی ان سے توقع نہیں کی جا سکتی۔ وہ شراب بہت پیتے ہیں اور اس کی وجہ سے ان کی صحت تیزی سے انحطاط کی طرف جا رہی ہے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کب تک زندہ رہ سکیں گے۔ انہیں زندگی کی بلندیوں کا احساس ہوتے ہوئے بھی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

ان باتوں کو سن کر معلوم ہوا کہ میراجی کون ہیں۔ اور کیا ہیں؟ اور اب میری دلچسپی نہ جانے کیوں میراجی سے اور بڑھ گئی۔ نہ جانے کیوں میرا جی چاہتا تھا کہ ان سے ملاقات ہو۔ میراجی ان دنوں لاہور میں رہتے تھے اور بعض مجبوریوں کی بنا پر میرا لاہور تک پہنچنا مشکل تھا۔ اس لیے کئی سال تک میری یہ آرزو پوری نہ ہوئی۔ میں میراجی کی نظمیں اور مضامین پڑھتا رہا، اور میراجی کو دیکھنے، ان سے ملنے اور ان کو قریب سے دیکھنے اور ان کا مطالعہ کرنے کی آتش فشاں

تیز سے تیز تر ہو گئی۔

کئی سال اس طرح گزر گئے۔ پھر ایک دفعہ خبر ملی کہ میراجی نے لاہور چھوڑ دیا ہے اور اب وہ دِلّی آ گئے ہیں۔ دہلی کے ریڈیو اسٹیشن میں انہیں کوئی ملازمت مِل گئی ہے اور وہ وہاں ریڈیو کے لیے فیچر اور گیت لکھتے ہیں۔ راشد، منٹو، کرشن چندر، اور اُپندر ناتھ اشک کے ساتھ ہی ریڈیو نے میراجی کو بھی اپنا اسیر کر لیا ہے۔ مجھے اس بات کا افسوس بھی ہوا اور خوشی بھی۔ افسوس تو اس کا کہ میراجی شاید اب تیزی سے نہیں لکھ سکیں گے جس تیزی سے وہ لاہور میں لکھتے تھے۔ انہیں تخلیقی کام کا موقع نسبتاً کم مِلے گا۔ اور خوشی اس بات کی کہ کبھی دِلّی جانا ہوا تو میراجی سے ملاقات ہو جائے گی۔ میں انہیں قریب سے دیکھ سکوں گا اور ان سے مختلف موضوعات پر گفتگو ہو سکے گی۔ ان دنوں کبھی کبھی لکھنؤ سے میرا دِلّی جانا ہوتا تھا۔

خُدا خُدا کر کے وہ دن آیا۔ میں دِلّی گیا تو دن میں ایک ضرورت سے ریڈیو اسٹیشن پہنچا۔ راجندر سنگھ بیدی میرے ساتھ تھے۔ سوچ کے چلے تھے کہ میراجی سے ضرور ملیں گے۔ پہلے اشک سے ملاقات ہوئی۔ میراجی اس وقت وہاں موجود نہیں تھے۔ میں نے اشک سے کہا کہ "اس وقت میں میراجی کی تلاش میں نکلا ہوں۔ ان سے ملاقات کی کوئی صورت نکلنی چاہیے" یہ سُن کر اشک اٹھے اور مجھے ساتھ لے کر ریڈیو اسٹیشن کے کمروں میں میراجی کو تلاش کرنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک کمرے میں میراجی مِل گئے۔ ان کو دیکھتے ہی اشک نے اپنے مخصوص لہجے میں انہیں پکارا۔ تب مجھے معلوم ہوا یہ میراجی ہیں۔

وہ اس وقت سیدھے سادھے لباس میں تھے۔ ان کے جسم پر ایک شیروانی تھی۔ ان کا پاجامہ علی گڑھ کاٹ کا تھا۔ ان کے بال یقیناً بہت بڑھے ہوئے تھے۔ لیکن چہرے پر بال نہیں تھے۔ ان کی مونچھیں، جن کا اتنا شہرہ تھا، وہ بھی مجھے ان کے چہرے پر نظر نہیں آئیں۔ دیکھنے میں ان کی صحت ایسی کچھ بُری نہیں معلوم ہو رہی تھی۔ ان کا بڑا اور چوڑا سا چہرہ خوب بھرا ہوا تھا۔ ان کا قد نہ زیادہ لمبا تھا نہ بہت زیادہ چھوٹا اور دیکھنے سے وہ خاصے مضبوط معلوم ہوتے تھے۔ ان کے منہ میں پان بھرا ہوا تھا اور جب وہ پان چباتے تھے تو ان

کے منہ سے بو آتی تھی۔

میرا اور ان کا غائبانہ تعارف کسی نہ کسی طرح ہو چکا تھا۔ چنانچہ جیسے ہی اشک نے تعارف کرانے کے لیے میرا نام لیا تو وہ انتہائی خلوص اور محبت کے ساتھ آگے بڑھے، ہاتھ ملایا اور گلے ملے۔ پھر ہم بیٹھ گئے اور باتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔

میں نے پوچھا "میراجی ریڈیو پر کیسی گزر رہی ہے؟۔ کہنے لگے "زندگی کے دن گزار رہا ہوں"۔

میں نے پوچھا "دن کو پروگرام کیا رہتا ہے؟"

جواب دیا "دن بھر ریڈیو کے لیے یہیں بیٹھ کر کچھ نہ کچھ لکھتا ہوں رات کو کبھی کبھی ڈرامے میں پارٹ بھی کر لیتا ہوں۔ اور جس روز میرا اپنا فیچر ہوتا ہے، اس روز کبھی کبھی ہدایات دینے کے لیے یہاں رک جاتا ہوں۔ ورنہ جب شام ہو جاتی ہے تو یہاں سے پیدل گھر کی طرف چل دیتا ہوں۔ میرا گھر یہاں سے کم از کم چار میل ہوگا۔ صبح کو بھی میں پیدل ہی یہاں آتا ہوں۔ بات یہ ہے عبادت صاحب! میں کچھ بد پرہیزیاں کر لیتا ہوں۔ اس لیے پیدل چلنے سے ان کا ازالہ ہو جاتا ہے"۔

ان کی یہ بات اس وقت میری سمجھ میں نہیں آئی۔ لیکن بعد میں مجھے اس بات کا علم ہوا کہ "بد پرہیزیوں" سے ان کا کیا مطلب تھا۔ اور آج کسی پر بھی یہ بات پوشیدہ نہیں ہے۔ میراجی بہت صاف گو تھے۔ وہ کوئی بات چھپا نہیں سکتے تھے۔

پہلی ہی ملاقات میں میراجی مجھ سے بہت قریب ہو گئے۔ ہم نے کھل کر مختلف موضوعات پر باتیں کیں۔ ان دنوں میرا ایک مضمون آزاد شاعری کی حمایت میں چھپا تھا اور قدامت پرستوں کے حلقے اس پر ہنگامہ کر رہے تھے۔ میراجی نے خود ہی ذکر کیا کہ میں نے وہ مضمون حال ہی میں پڑھا ہے۔ اور پھر وہ دیر تک آزاد شاعری کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے رہے۔ ان کی باتوں میں بڑا وزن تھا۔ انہوں نے اس سلسلے میں جو بات بھی کہی منطقی انداز میں کہی۔ پھر کچھ حسن اور حسن پرستوں کا ذکر چھڑ گیا۔ میں نے دیکھا اور محسوس

کیا کہ حسن پرستی کے سلسلے میں عورت کا ذکر کرتے ہوئے وہ اس میں ڈوب ڈوب اور کھو کھو گئے۔ حسن کا بڑا شدید احساس ان کے اندر موجود تھا اور اس موضوع پر بات کرتے ہوئے وہ جھوم جھوم جاتے تھے۔ اس کے بعد بات کچھ جنسیات پر چل نکلی اور میں نے محسوس کیا کہ میراجی اس موضوع پر بھی نہایت کھل کر گفتگو کرنے کو اچھا سمجھتے ہیں۔ ان کی گفتگو سے یہ اندازہ ہوا کہ فرائڈ کے نظریے سے انہیں خاصی دلچسپی ہے۔ وہ اس کی بہت سی باتوں کو صحیح مانتے ہیں اور انہوں نے اس کا گہرا مطالعہ بھی کیا ہے۔

میں نے منہ کا مزہ بدلنے کے لیے موضوع گفتگو ذرا بدلا اور ادب و تنقید کی بات چھیڑ دی۔ میراجی نے اس موضوع پر بھی خیالات کا اظہار شروع کر دیا۔ انہوں نے فن برائے فن کے نظریے کی اہمیت اس طرح بتائی جیسے وہ مجھے راہ راست پر لانا چاہتے ہیں۔ انہیں شاید پہلے سے اس بات کا اندازہ تھا کہ اس معاملے میں میرے ان کے درمیان بنیادی اختلافات ہیں اور میں اس معاملے میں کبھی بھی ان کا ہم نوا نہ ہو سکوں گا۔ اس لیے انہوں نے وکالت کا حق ادا کر دیا۔ لیکن اس کے باوجود میں نے یہ محسوس کیا کہ اس سلسلے میں بھی جو باتیں انہوں نے کیں ان میں ذہانت کی بجلیاں کوندتی ہوئی نظر آتی تھیں۔ ان میں جدت اور اُپج کا پتہ چلتا تھا۔

اسی ملاقات میں میراجی نے اپنی غیر معمولی دلچسپی کا اظہار اُردو زبان سے بھی کیا۔ کہنے لگے "عبادت صاحب، اُردو زبان میں بڑا رس ہے۔ میری مادری زبان اردو ہے۔ لیکن اس کو کیا کروں کہ میری ماں کی زبان اُردو نہیں ہے۔ میری ماں اُردو نہیں بولتی" اور یہ بات اپنے دلچسپ انداز میں وہ اکثر دوستوں سے کہا کرتے تھے۔

ان کی باتوں کا یہ سلسلہ کبھی بھی ختم نہ ہوتا۔ لیکن دیر بہت ہو گئی تھی اور مجھے ایک دوسری جگہ جانا تھا۔ اس لیے میں پھر ملنے کا وعدہ کر کے میراجی سے رخصت ہوا۔ میراجی ریڈیو اسٹیشن ہی پر رُک گئے، کیونکہ اس روز ان کا کوئی فیچر ہونے والا تھا اور وہ ہدایات کے سلسلے میں اپنی موجودگی کو وہاں ضروری سمجھتے تھے۔

میراجی سے رخصت ہو کر میں پارلیمنٹ اسٹریٹ پر کناٹ پلیس کی طرف چلنے لگا۔

میراجی کی باتیں میرے ذہن میں گونج رہی تھیں۔ ان کی شخصیت مجھ پر چھائی ہوئی تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ میرے ساتھ ہیں۔ اور میں یہ سوچتا ہوا آگے قدم بڑھا رہا تھا کہ میراجی بلا کے ذہین ہیں۔ ان کا مطالعہ بھی بہت وسیع ہے۔ انہوں نے مختلف مسائل پر بھی غور کیا ہے۔ وہ ہر موضوع پر اپنی مخصوص رائے رکھتے ہیں۔ ان کے مزاج میں بڑی سادگی ہے۔ یہاں تک کہ انہیں اپنی اہمیت تک کا احساس نہیں۔ ان کے نظریات میں کتنا خلوص ہے۔ وہ کیسے نئے انداز میں سوچتے ہیں۔ ان کا زاویۂ نظر کس قدر تجزیاتی ہوتا ہے۔ ان کے فنی شعور میں کس قدر پختگی ہے۔ ان کا احساس جمال کس قدر شباب پر ہے؟ ان کے فکر کی پرواز کتنی بلند ہے۔ ان کے شعور میں کس درجہ رچی ہوئی کیفیت ہے۔ وہ کتنے صاف گو ہیں۔ ان کے مزاج میں کس قدر بے باکی ہے۔ وہ کتنے کشادہ دل ہیں۔ زندگی اس کی رنگینیوں، رعنائیوں اور سرمستیوں کا کیسا رچا ہوا احساس ان کے یہاں موجود ہے۔ ان کی ذہانت کا کیا ٹھکانا ہے لیکن ان تمام خوبیوں کے باوجود نہ جانے کیوں وہ اس قدر لاپرواہیں۔ نہ جانے کیوں انہیں اپنی ذات عزیز نہیں اور وہ اپنے آپ سے اس قدر بیزار کیوں ہیں؟ کیوں ان کے یہاں اس قدر اداسی ہے؟ وہ کیوں کچھ کھوئے کھوئے سے، کچھ ڈوبے ڈوبے سے اور کچھ بہکے بہکے سے نظر آتے ہیں؟ کیوں وہ اپنی پروا نہیں کرتے؟ کیوں انہیں اپنی زندگی میں ایک خلا سا نظر آتا ہے۔ ان کی باتیں اس بات کو کیوں ظاہر کرتی ہیں کہ ان کی زندگی میں تاریکی ہی تاریکی ہے؟ کیوں باوجود ایک بڑائی کے ان کے مزاج میں ایک لاابالی پن پایا جاتا ہے؟ ان کی مسکراہٹ میں وہ شگفتگی اور شیرینی کیوں نہیں ہے جو ہونی چاہیئے؟ ان کی شوخیاں بھی اداسیوں سے کیوں ملی جلی نظر آتی ہیں۔ وہ اتنی شراب کیوں پیتے ہیں کہ منہ سے بھبکے نکلتے ہیں؟۔ وہ دنیا کو کیوں بھلا دینے کی کوشش کرتے ہیں؟ ان کی ہنسی میں بھی ایک کرب کی سی کیفیت کیوں ہے؟

یہ اور اسی طرح کے ملے جلے خیالات مجھے گھیرے ہوئے تھے۔ میراجی، ان کی شخصیت

ان کا مزاج، ان کی تمام خصوصیات، ان کے سارے مسائل مجھ پہ اس طرح چھائے ہوئے تھے کہ میں اور کچھ سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ میرے قدم راستے پر آگے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ہر چیز پیچھے چھوٹی جا رہی تھی لیکن میراجی کا خیال نظروں سے کسی طرح بھی اوجھل نہیں ہوتا تھا۔ اس ملاقات نے میرے ذہن پہ گہرے نقوش چھوڑے تھے۔

اس ملاقات کے بعد میں کئی مہینے تک میراجی سے نہ مل سکا۔ لیکن کچھ عرصے بعد ایک ایسی صورت نکلی کہ مجھے مستقل طور پر دلّی میں قیام کرنا پڑا۔ میراجی ابھی تک ریڈیو میں تھے۔ جب میں مستقل طور پر دلی پہنچا تو خیال تھا کہ ان سے برابر ملاقات ہوتی رہے گی لیکن یہ آرزو خاطر خواہ پوری نہ ہوئی۔ کچھ تو میں بہت مصروف رہا اور کچھ میراجی وقت کے ساتھ ساتھ اپنے آپ میں زیادہ ڈوبتے گئے۔ پھر بھی گاہے گاہے اُن سے ملاقات ہوتی رہی اور مختلف موضوعات پر تبادلۂ خیالات کا موقع ملتا رہا۔ کبھی کبھی انہیں کتابوں کی ضرورت ہوتی تو وہ اینگلو عربک کالج میں آجاتے۔ کتابیں مل جاتیں تو پھر ٹھہرتے بہت کم تھے۔ بس فوراً چل دیتے تھے۔ کبھی سڑک پر چلتے ہوئے ان سے ملاقات ہو جاتی تھی کبھی ریڈیو سٹیشن پہ ملاقات ہو جاتی تھی۔ مکان پر ان سے ملنا مشکل ہوتا تھا۔ کیونکہ وہ جائے قیام پہ بہت کم رہتے تھے۔ دن کو جوں توں شام کرنے کے بعد، رات گئے وہ مکان میں جا کر پڑ رہتے تھے۔ چھٹی کے دن ان کا رنگ دوسرا ہوتا تھا۔ بہر حال میں ان سے گھر پہ کبھی نہ مل سکا۔ دو ایک دفعہ کوشش کی تو ناکامی ہوئی۔ لیکن میرے ایک دوست اتوار کے دن انہیں گھر پر پکڑ ہی لیتے تھے۔ ان سے یہ حال معلوم ہوتا تھا کہ کس طرح وہ صبح کو پہنچے۔ آواز دیتے تو میراجی اندر ہی سے پکار کر کہتے کہ ذرا رکیئے۔ میں ابھی آتا ہوں۔ وہ کسی کام میں مصروف ہوتے تھے۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد وہ باہر نکلتے اور انہیں اندر لے جا کر بٹھاتے، اپنے دن بھر کے پروگرام سے آگاہ کرتے۔ تھوڑی دیر گپ ہوتی اور پھر انہیں رخصت کر دیتے۔

میرے یہی دوست بیان کرتے تھے کہ میراجی کو اپنے گھر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

ایک کمرہ تھا۔ اس میں فرش لگا ہوا تھا۔ فرش پر چاروں طرف کتابیں بکھری رہتی تھیں۔ میراجی جب رات کو اس کمرے میں پہنچتے تو انہیں کتابوں میں دفن ہو جاتے تھے۔ دِلّی میں انہیں پڑھنے کا موقع بہت کم ملتا تھا۔ اس کی وجہ کچھ تو دن بھر کی مصروفیت تھی اور کچھ ان کا جسمانی و ذہنی انحطاط۔ حقیقت یہ ہے کہ میراجی کا مطالعۂ ادب لاہور میں اپنے شباب پر تھا۔ جتنا انہوں نے لاہور میں پڑھا، اس کا عشرِ عشیر بھی دلی میں نہ پڑھ سکے اور اس بات کا احساس انہیں خود بھی بہت زیادہ تھا۔ وہ اس پر کُڑھتے اور افسوس بھی کرتے تھے۔ لیکن بے بسی ان کے راستے میں حائل تھی، مجبوریاں پہاڑ بن گئی تھیں۔

دلّی کے دورانِ قیام میں ایک دفعہ بڑا دلچسپ واقعہ ہوا۔

اینگلو عربک کالج میں ہر سال ایک بڑا شاندار مشاعرہ ہوتا تھا۔ ایک سال جب میراجی دلّی ہی میں تھے اس مشاعرے کو ترتیب دینے کا کام میرے سپرد کیا گیا۔ عربک کالج کے سالانہ مشاعرے کی شاندار روایات کے پیشِ نظر میں نے اس مشاعرے کو زیادہ سے زیادہ کامیاب بنانے کی کوشش کی اور اس سلسلے میں یہ سوچا کہ مشاعرے میں کوئی جدت کرنی چاہیئے۔ اور اس سے بڑی جدت اور کیا ہو سکتی تھی کہ جدید سے جدید تر شاعروں کو اس مشاعرے میں مدعو کیا جائے جو عموماً مشاعروں سے کتراتے ہیں۔ شاید اس وجہ سے کہ عوام کے لیے ان کی نظموں کا سمجھنا مشکل ہوتا ہے۔

چنانچہ میں نے یہ طے کیا کہ اس مشاعرے میں میراجی کو ضرور بلایا جائے اور انہیں مجبور کیا جائے کہ وہ اپنا کلام ضرور سنائیں۔ میراجی سے میں نے خود جا کر کہا لیکن وہ کسی طرح راضی نہ ہوئے۔ خط لکھا تو اسی خط پر یہ عبارت لکھ دی "عبادت صاحب، مشاعرے کی بات چھوڑیئے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ بہت جلد آپ کا کمرہ حلقہ اربابِ ذوق کا "معبد" بننے والا ہے۔" (میراجی)۔

ان دنوں حلقہ اربابِ ذوق کی ایک شاخ دِلّی میں قائم ہونے والی تھی اور میراجی اس کام میں پیش پیش تھے۔ اس خط میں مشاعرے میں شریک ہونے کا کوئی ذکر نہیں تھا

لیکن میں نے اپنی کوشش جاری رکھی۔ میں بھی دُھن کا پکا تھا اور میں نے یہ تہیّہ کر لیا تھا کہ پرانے شاعروں کے دوش بدوش جدید سے جدید تر شاعر اور خصوصیت کے ساتھ میراجی اس مشاعرے میں ضرور پڑھیں گے۔ چنانچہ باقاعدہ ایک اسکیم بنائی گئی جس پر عمل کرنے کی صورت میں میراجی کا مشاعرے میں آجانا یقینی تھا۔

طے یہ ہوا کہ کالج کے چند طالب علم، جو میراجی کو جانتے ہیں، روزانہ ان کے پاس جاتے رہیں گے اور یہ کہتے رہیں گے کہ میراجی آخر جدید شاعر ہیں۔ ان پرانے شاعروں سے ایسے کون سے ہیٹے ہیں کہ وہ تو مشاعرے میں اپنا کلام پڑھیں اور جدید شاعروں کے لیے یہ راستہ بند ہو۔ یہ تو ہم سب کے لیے خصوصاً جدید ادب والوں کے لیے بڑی بے عزتی اور شرم کی بات ہے۔ دلی میں لوگ یہ کہتے پھر رہے ہیں کہ اگرچہ عربک کالج والوں نے اس بات کا اعلان کیا ہے کہ جدید شاعر بھی اس مشاعرے میں شریک ہوں گے لیکن قدیم شاعروں کے مقابلے میں بھلا وہ بیچارے کیا آسکتے ہیں؟ اور آ بھی جائیں تو مشاعرہ بہرحال قدیم شعرا ہی کے ہاتھ میں رہے گا۔ اس دفعہ تو ان کی اس بات کو غلط ثابت کر کے دکھا دینا چاہیئے۔

کئی دن تک جب یہ اور اسی طرح کی باتیں میراجی کے سامنے کی گئیں تو وہ کچھ نرم پڑے اور مشاعرے کے دن انہوں نے بالآخر یہ کہہ ہی دیا کہ "اس مشاعرے میں ضرور جانا چاہیئے۔"

طالب علموں نے یہ بات آکر مجھے بتائی۔ میں نے کہا "چلو کامیابی ہوگئی۔ اب مشاعرے میں لطف رہے گا۔"

لیکن مشکل یہ تھی کہ میراجی رات کو بے حال ہو جاتے تھے۔ دن میں اتنی شراب پی لیتے تھے کہ رات پڑنے تک انہیں ہوش نہیں رہتا تھا۔

بہرحال میں نے چند طالب علموں کو دن ہی میں ان کے پاس بھیج دیا اور یہ تاکید کر دی کہ شام تک ان کے ساتھ رہیں اور مشاعرے میں انہیں اپنے ہمراہ لے کر آئیں۔ ورنہ ان کا کچھ ٹھیک نہیں۔

مشاعرہ رات کو آٹھ بجے شروع ہونے والا تھا۔ سات ہی بجے سے ہال کھچا کھچ بھر گیا۔ دلّی میں عربک کالج کے مشاعرے کا لوگ سال بھر تک انتظار کرتے تھے۔ اور واقعی مشاعرہ ہوتا بھی بہت اچھا تھا۔ خیر تو ٹھیک آٹھ بجے مشاعرہ شروع ہوا۔ ساڑھے آٹھ بجے کے قریب جدید شاعر پہنچے۔ ان میں میراجی نہیں تھے۔ میں سمجھا شاید اب وہ نہیں آئیں گے۔ لیکن نو بجے کے قریب دیکھا کہ چند طالب علم میراجی کو گھیرے ہوئے حال میں داخل ہو رہے ہیں۔ میں نے انہیں سہارا دے کر ڈائس پر بٹھایا۔ وہ نشے میں دُھت تھے۔ ان کی آواز نہیں نکل رہی تھی اور اپنی رو میں یہی کہے جا رہے تھے کہ "میں آ تو گیا ہوں، لیکن پڑھوں گا نہیں"۔

میں نے کہا "نظم نہ ہو سکے تو غزل ہی کے چند شعر پڑھ دیجیے"۔ چونکہ اعلان کر دیا گیا تھا کہ مشاعرے میں میراجی آ گئے ہیں، اس لیے سامعین ان کو دیکھنے اور ان کا کلام سُننے کے مُشتاق تھے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ صاف ستھرا باذوق لوگوں کا مجمع تھا اور دوسرے ان دنوں میراجی کی نظموں نے ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔ مخالفین نے اور بھی اس ہنگامے کو ہوا دی تھی۔

جب سامعین کا اصرار بڑھا اور آوازیں آنے لگیں کہ میراجی کو پڑھوایئے تو میں نے میراجی سے درخواست کی۔ اب کے انہوں نے میری بات مان لی۔ میں نے اعلان کیا تو مائیکروفون پر آئے۔ خود ہی ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں کچھ اپنے بارے میں کہا۔ اور پھر اپنی غزل کا صرف ایک شعر پڑھا اور پڑھنے کے بعد فوراً ہی ہال کے باہر چلے گئے۔ لاکھ روکا لیکن نہ رُکے۔ وہ بھلا اپنے حواس میں کب تھے کہ کسی کی بات کا خیال کرتے۔ لیکن میرا مقصد پورا ہو گیا۔ میں نے میراجی کو کئی ہزار کے مجمع میں پڑھوا دیا تھا ان میں سے ہر ایک نے میراجی کو دیکھ لیا تھا اور ان کا کلام انہی کی زبانی سُن لیا تھا۔ یہ کتنی بڑی بات تھی؟ ورنہ کہاں میراجی اور کہاں ایک قدیم طرز کا مشاعرہ!۔

میں نے مشاعرے کے سلسلے میں جو خط انہیں بھیجا تھا۔ اس کو انہوں نے یہ لکھ کر

واپس کر دیا تھا کہ "آپ کا کمرہ حلقۂ ارباب ذوق کا "معبد" بننے والا ہے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ اگلے ہی ہفتے سے حلقہ ارباب ذوق کے جلسے باقاعدگی کے ساتھ ہر اتوار کو عربک کالج میں ہونے لگے۔ ان جلسوں میں میراجی سکریٹری کے فرائض انجام دیتے تھے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ جس دن جلسہ ہوتا تھا، اس دن انہیں ہوش آجاتا تھا، ورنہ ہفتہ بھر تک وہ بے ہوش بلکہ مدہوش رہتے تھے۔ جلسے میں وقت کی پابندی سے آ، ان کا دستور تھا۔ جلسے سے قبل سارا انتظام خود کرتے تھے۔ یہاں تک کہ بعض دن تو یہ دیکھا گیا کہ میراجی اپنے اوپر کرسیاں لاد لاد کر لا رہے ہیں اور جس جگہ جلسہ ہوتا تھا، وہاں رکھ رہے ہیں۔ جلسے میں وہ شروع سے آخر تک بیٹھتے تھے اور جو بحث ہوتی تھی، اس کے نوٹس لیتے جاتے تھے۔ نوٹس لینے کے سلسلے میں کہنے والوں کے منہ سے نکلی ہوئی شاید ہی کوئی بات ایسی ہوتی ہو جس کو میراجی نہ لکھ لیتے ہوں۔ بعض دفعہ تو ایسا بھی ہوا کہ بحث کرتے ہوئے اگر بحث کرنے والوں کو چھینک بھی آگئی ہے تو انہوں نے یہ بھی لکھ دیا ہے کہ اس کے بعد صاحب مضمون کو یا فلاں صاحب کو ایک زور کی چھینک آئی جس کی وجہ سے وہ رُکے اور پھر انہوں نے سلسلہ کلام کو جاری رکھا۔ وغیرہ وغیرہ۔

جلسے کی جو کارروائی میراجی خود اپنے قلم سے لکھتے تھے وہ سُننے کے قابل ہوتی تھی۔ حلقے کے اجلاس میں گرما گرم بحثیں ہوتی تھیں لیکن میراجی خود بحث میں حصہ کم ہی لیتے تھے۔ اس لیے نہیں کہ وہ سکریٹری تھے بلکہ ان سے زیادہ بات نہیں کی جاتی تھی۔ پھر بھی کبھی کبھی بحث طلب موضوع پر ایسی بات کہتے تھے کہ جی خوش ہو جاتا تھا اور ان کی ذہانت کی داد دینی پڑتی تھی۔ پھر ان کے بات کہنے کا انداز بھی کچھ کم دلچسپ نہیں ہوتا تھا۔ اس انداز کی وضاحت الفاظ میں مشکل ہے۔ جلسے میں جو مختلف مضامین پڑھے جاتے تھے، اور ان پر جو بحثیں ہوتی تھیں، ان سے وہ بڑی دلچسپی کا اظہار کرتے تھے۔ کسی مصنف پر اگر مضمون پڑھا جاتا تھا تو بحث کے سلسلے میں پیش کرنے کے لیے اس مصنف کی کتابیں یا اس سے متعلق جو مواد مل سکتا تھا وہ میراجی اپنے ساتھ لے آتے تھے۔

مجھے یاد ہے میں ایک دفعہ حلقے کے ایک جلسے میں میں احتشام صاحب کی تنقید نگاری پر مضمون پڑھنے والا تھا۔ جس دن مجھے مضمون پڑھنا تھا اس دن دیکھا کہ میراجی احتشام صاحب کی کتاب "تنقیدی جائزے" اور چند مضامین لیے چلے آرہے ہیں۔

میں نے پوچھا "یہ کس لیے لے آئے"، کہنے لگے "اس سے بحث میں آسانی ہوگی۔ شاید ضرورت پیش آجائے"۔

حلقہ ارباب ذوق کے جلسوں سے یہ فائدہ ہوا کہ میراجی سے ہر اتوار کو ملاقات ہو جاتی تھی۔ لیکن جلسے کے دن ان پر کچھ عجیب کیفیت رہتی تھی۔ وہ اس دن ادھر ادھر کی باتیں کرنے سے بچتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی مقدس فریضے کو انجام دینے آئے ہیں اور سوائے اس کے انہیں اور کسی بات کا خیال نہیں۔ یہی کام ان کے ذہن پر مسلط ہے اور اس لیے وہ کچھ اور سوچ ہی نہیں سکتے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس دن وہ کچھ اور نہیں کرتے تھے۔ دن بھر انہیں یہی خیال رہتا تھا کہ آج جلسے میں جانا ہے۔ چنانچہ بعض دن تو ایسا ہوا ہے کہ جلسہ پانچ بجے شروع ہونے والا ہے اور وہ تین بجے عربک کالج کی عمارت کے سامنے کی سیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔

مجھے ایک دن خود اس کا تجربہ ہوا۔

اتوار کے دن تین بجے کے قریب کسی ضرورت سے باہر جانے کے لیے میں نیچے اُترا تو دیکھا میراجی سامنے بیٹھے ہیں۔

میں نے دیکھتے ہی کہا "بھئی ابھی سے کیسے آگئے؟"

کہنے لگے "جی نہیں لگ رہا تھا۔ اس لیے آگیا۔ آج کے دن کوئی اور کام نہیں ہوتا۔"

میں نے کہا اگر جلدی آگئے تھے تو اوپر آگئے ہوتے۔ آخر میں یہیں رہتا ہوں"۔

اور انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا "کچھ خیال نہیں رہا۔ پھر یہ بھی سوچا کہ شاید اور لوگ آئے ہوں گے۔ ان کا انتظار کرنے لگا"۔

اس کے بعد کوئی کیا کہہ سکتا تھا۔

ہاں جلسہ شروع ہونے سے قبل اگر میراجی کے پاس پان نہیں ہوتے تھے تو وہ اجمیری دروازے کے بازار میں پان کھانے ضرور جاتے تھے۔ بغیر پان کے اُن سے بیٹھا نہیں جاتا تھا اور اس معاملے میں وہ بڑے ہی فیاّض تھے۔ بہت سے پان لے آتے تھے اور جو لوگ ان کے پاس بیٹھے ہوتے تھے، ان کو پان ضرور کھلاتے تھے۔ بلکہ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ سارے پان میز پر رکھ دیتے تھے جس کا جی چاہے کھائے۔ میں نے تو اسی وجہ سے جلسے میں ان کے پاس بیٹھنا شروع کر دیا تھا۔

حلقے میں میراجی کی ہر مہینے ایک نظم ضرور ہوتی تھی۔ بڑی پابندی سے وہ نظموں کی بہت سی نقلیں ٹائپ کروا کے لاتے تھے۔ بحث میں انہیں بڑا مزہ آتا تھا۔ خود تو وہ بحث میں زیادہ حصّہ نہیں لیتے تھے لیکن چاہتے تھے کہ دوسرے کُھل کر بحث کریں۔ اس بحث کو وہ بڑے غور سے سُنتے تھے۔ بحث کے وقت ان پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اس میں کھو گئے ہیں اور جو کچھ ہو رہا ہے، اس کو بڑی بلندی سے دیکھ رہے ہیں۔ اس وقت ان کی بُردباری اور خود اعتمادی دیکھنے والی ہوتی تھی۔ وہ بولتے نہیں تھے لیکن چہرے سے اس کا اظہار ہو جاتا تھا۔

بحث کے سلسلے میں ایک دفعہ بڑا لُطف رہا۔ میراجی نے جلسے میں ایک طولانی آزاد نظم پڑھی۔ ٹائپ میں پورے دو صفحوں پر پھیلی ہوئی تھی۔ جب میراجی اس نظم کو پڑھ چکے تو بحث کا آغاز ہوا۔ صرف موضوع پر کوئی آدھ گھنٹے سے زیادہ بحث ہوئی لیکن نظم کے بعض پہلو واضح نہ ہو سکے۔

میں نے تجویز پیش کی کہ اب ہمیں شاعر کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ جی یہ چاہتا تھا کہ میراجی کچھ بولیں۔

چنانچہ میراجی بولے اور انہوں نے نظم کے کئی بندوں کی وضاحت کی۔ بہت سی باتیں ذہن نشین بھی ہو گئیں۔ لیکن ایک بند کی جب وہ وضاحت کرنے لگے، غالباً وہ نظم کا تیسرا بند تھا، تو میراجی کچھ اُلجھ گئے۔ تھوڑی دیر توقّف کیا اور پھر کہا کہ "یہ بند تو تشاعوں

کی بھی سمجھ میں بھی نہیں آتا۔ اور کوئی ضروری بھی نہیں کہ سمجھ میں آئے۔"

اس بات پر حاضرین کھلکھلا کر ہنسے۔"

آج مجھے جب وہ واقعہ یاد آتا ہے تو میں سوچتا ہوں میراجی کس قدر صاف گو تھے۔ ان کے مزاج میں کس قدر بے باکی تھی۔ خیالات کی جو لہریں بھی اٹھتی تھیں وہ ان کو چھپاتے نہیں تھے۔ بلکہ فوراً اظہار کر دیتے تھے۔

میراجی کی ذات دلّی کے حلقے کے لیے شمع انجمن کی حیثیت رکھتی تھی۔ ایک تو وہ خود ہی کیا کم دلچسپ تھے۔ ان کی شخصیت بذاتِ خود ایک انجمن تھی۔ وہ اپنے دامن میں نہ جانے کتنی محفلوں کا سوز و ساز لے کر آتے تھے اور دوسرے ان کا وجود ایک ایسا ماحول پیدا کر دیتا تھا کہ ہر شخص کی طبیعت رواں ہو جاتی تھی۔ ان کو قریب سے جاننے والے جلسے میں بیٹھے ہوئے کچھ کانا پھوسی کرتے رہتے تھے۔ اس کا موضوع میراجی اور ان کی کوئی عجیب و غریب حرکت ہوتی۔ کبھی کبھی اچھے انداز سے ایک نہ ایک پھبتی بھی کس دیتا تھا۔ اکثر ایسا ہوا کہ اشاروں نے بھی اس پھبتی کا کام دیا ہے۔ لیکن میراجی خاموش رہتے تھے۔ کبھی کبھی ذہانت میں ڈوبی ہوئی کوئی بات ان کے منہ سے نکل جاتی تھی لیکن انہیں بگڑنا نہیں آتا تھا۔ ناراض ہونا وہ جانتے ہی نہیں تھے۔ برخلاف اس کے ایسا موقع جب کبھی بھی آتا تو ان کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ کھیلنے لگتی تھی۔ جیسے ان کی نظریں کچھ کہنا چاہتی ہوں لیکن وہ جان کر کچھ کہنا نہ چاہتے ہوں۔ کس قدر معنویت ہوتی تھی ان کے ان اشاروں میں شوخی کی چمک بھی مجھے میراجی کی آنکھوں میں ایسے ہی موقعوں پہ نظر آئی۔ ان کی آنکھوں کی حرکت سے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے دور کہیں جگنو چمک رہے ہوں۔

دہلی کے دوران قیام میں ایک دفعہ بڑا ہی دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ لاہور میں ایک صاحبہ تھیں۔ انہوں نے اتفاق سے ریڈیو پہ کوئی تقریر کی۔ میراجی ان صاحبہ سے نسبت رکھتے تھے اور ان کی محبت کا دم بھرتے تھے۔ یار لوگوں کو بھی اس کا علم تھا۔ تقریر ہوئی تو اس بہانے ان کی تصویر چھاپنے کی فکر کی گئی۔ بھلا انہیں کیا اعتراض

ہو سکتا تھا؟ ریڈیو کے ہر شعبے میں سب اپنے ہی لوگ تھے۔ چنانچہ یہ تصویر "انڈین لسنر" کے سرورق پر چھاپ دی گئی۔ سارے شہر میں دھوم مچ گئی۔ اس تصویر کی اصل کاپی کسی نہ کسی طرح دفتر سے حاصل کر لی گئی۔ اور وہ دلی کے ادبی حلقوں میں موضوع بحث بنی رہی۔ شاید ہی کوئی میراجی کی ذات سے دلچسپی لینے والا ایسا ہو جس نے اس تصویر کو نہ دیکھا ہو۔ اور دو ایک روز محض خوش گپیوں کی خاطر اپنے پاس نہ رکھا ہو۔ جو سنتا تھا وہ اس کی زیارت کے لیے دوڑا آتا تھا۔ ہفتوں وہ تصویر اسی طرح گشت کرتی رہی اور اس پر طبع آزمائیاں ہوتی رہیں۔ میراجی کو دکھا کر اور سنا کر ایسا کیا جاتا تھا بلکہ یہی تو اس کا ایک دلچسپ پہلو تھا۔

میراجی اس پر بہت جز بز ہوتے تھے۔ جیسے ان کی رسوائی ہو رہی ہو لیکن اس رسوائی میں بھی وہ خوش تھے۔ یہ رسوائی بھی انہیں اپنے لیے معراج نظر آتی تھی۔

بہت سے لوگ جمع ہوں تو میراجی کھلتے بہت کم تھے۔ ان کو جاننے اور سمجھنے کے لیے، ان سے ہنسنے اور بولنے کے لیے، بحث اور تبادلہ خیال کرنے کے لیے تنہائی اور سکون کی شرطیں لازمی تھیں۔ ہنگامے میں وہ دیکھنے کی چیز ہوتے تھے، ملنے اور بات کرنے کی نہیں۔ جب بہت سے لوگ جمع ہوں تو ان کی حالت دیکھنے والی ہوتی تھی۔ ہر بات کا ردعمل ان کے چہرے پر دیکھا جا سکتا تھا۔ چنانچہ مجمع میں تو میں انہیں صرف دیکھا کرتا تھا اور دیکھ کر لطف لیا کرتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے موقعوں پہ وہ مطالعے کی چیز بن جاتے تھے۔ ان کے سامنے جتنی باتیں بھی ہوتی تھیں، ان سب کے ملے جلے اثرات کا عکس ان کے چہرے پر جھلکتا تھا۔ ان کی حرکات و سکنات میں نظر آتا تھا۔ جب ان سے گفتگو کرنا ہوتی جب یہ جی چاہتا کہ میراجی باتیں کریں تو انہیں تنہا ہی گھیرنا پڑتا۔ کیونکہ ویسے وہ بڑی مشکل سے ہتھے چڑھتے تھے۔ لیکن جب اس طرح مل جاتے تو ان سے خوب باتیں ہوتیں۔ وہ اپنے آپ کو پوری طرح نمایاں کر دیتے تھے۔ چنانچہ ایسی ملاقاتیں ان سے متعدد بار ہوئیں۔ شاید ہی زندگی اور شعر و ادب کا

کوئی موضوع ایسا ہو جس پر ہم نے ان ملاقاتوں میں تبادلۂ خیال نہ کیا ہو۔ میراجی ان تمام موضوعات پر اپنی ایک رائے رکھتے تھے۔ ان سے اختلاف کیا جا سکتا تھا لیکن ان کے خلوص میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں نکل سکتی تھی۔ بہت سے مسائل پر میرے ان کے درمیان اختلافات تھے لیکن میں ان کی عزت کرتا تھا۔ کیونکہ جو رائیں انہوں نے قائم کی تھیں وہ خلوص پر مبنی تھیں۔

ان صحبتوں میں جو دلچسپیاں تھیں ان کا کیا کہنا۔ لیکن ان سب پر اداس سی پڑ گئی۔ جب ایک سال میں نے موسم گرما کی تعطیلات کے بعد دلی آکر یہ سنا کہ میراجی نے دلی چھوڑ دی اور وہ بمبئی چلے گئے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ بمبئی میں وہ کسی فلم کمپنی کے لیے گیت لکھیں گے۔ پھر ان کے بارے میں طرح طرح کی خبریں مشہور ہوتی رہیں۔ مثلاً یہ کہ مکالمے اور گیت تو خیر وہ لکھتے ہی ہیں لیکن انہیں پروڈیوسر بننے کا بھی موقع مل گیا ہے۔ میراجی کے پاس بہت روپیہ ہے۔ اب وہ اچھی سے اچھی شراب پینے لگے ہیں۔

خیر یہ سب باتیں تو سمجھ میں آتی تھیں لیکن ایک خبر ایسی مشہور ہوئی جس پر یقین نہیں آتا تھا۔ وہ یہ بھی کہ میراجی نے کئی شاندار سوٹ بنا لیے ہیں اور بمبئی کے بازاروں میں سوٹ پہنے پھرتے ہیں۔ اس کی توقع ان سے نہیں تھی کیونکہ لباس کے معاملے میں وہ حد درجہ لاپروا واقع ہوئے تھے۔ شاید وہ اچھے کپڑوں کو بھی خراب کر کے پہنتے تھے۔ صاف ستھرے کپڑوں کو بھی غالباً وہ پہننے سے قبل میلا کر لیا کرتے تھے۔ اس لیے سلک کے سوٹ کی جب خبر آئی تو سب کو بہت تعجب ہوا۔ لیکن خیر اس کی مٹی جلد ہی پلید ہو گئی ہو گی۔ آخر سلک میراجی کا ساتھ کب تک دے سکتی تھی؟

میراجی کے بمبئی جانے کے تھوڑی ہی عرصہ بعد ہندوستان کی تقسیم ہوئی اور پاکستان بن گیا لیکن ہر طرف ہنگامے شروع ہوئے۔ خصوصاً ہندوستان میں ذہنی سکون تو باقی ہی نہیں رہا۔ جانیں تو بچ گئیں لیکن حالات کچھ ایسے پیدا ہوئے کہ ایک کو دوسرے کی خبر ہی نہیں رہی۔

میراجی ان دنوں بمبئی ہی میں تھے لیکن اب ان کی خیر خبر بھی کم ہی ملتی تھی۔ اتنا معلوم تھا کہ وہ فلم ہی کے سلسلے میں کہیں ہیں اور وہ بمبئی سے کہیں اور جانا نہیں چاہتے۔ کچھ عرصے بعد بمبئی سے ان کا رسالہ "خیال" میرے پاس آنا شروع ہوا اور پھر میراجی اور اختر الایمان کے خطوط بھی اس سلسلے میں آئے۔ خط وکتابت کا سلسلہ تھوڑے ہی دن باقی رہا۔ میں بعض مصروفیتوں اور الجھنوں کی وجہ سے "خیال" میں کوئی مضمون نہ لکھ سکا۔ اور پھر میراجی نے خط لکھنا چھوڑ دیا۔ لیکن یہ مجھے معلوم ہے کہ وہ ناراض نہیں ہوئے تھے۔ دوسرے کی طرف سے بُرائی اُن کے دل میں بہت ہی کم آتی تھی۔

اور پھر ایک دن مجھے اخبارات سے یہ اطلاع ملی کہ میراجی اس دنیا سے چل بسے۔ پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ میں کبھی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میراجی اتنی جلدی چلے جائیں گے۔ غموں نے انہیں مار ڈالا۔ وہ رنج والم اور درد وکرب کا ایک مجسمہ تھے انہیں زندگی کی کوئی منزل بھی راس نہیں آئی۔ وہ زندگی بھر تڑپتے اور تلملاتے رہے اور بالآخر انہوں نے تڑپ تڑپ کر اپنی جان دے دی۔ جس طرح وہ مرے اس کی نوعیت اُن کی زندگی سے بھی زیادہ افسوسناک ہے۔ انہوں نے ایک ہسپتال میں جان دی۔ ان کا اپنا عزیز کوئی بھی ان کے پاس موجود نہیں تھا۔ صرف دو ایک دوست تھے۔ مرنے سے قبل ان کی مالی حالت اچھی نہیں تھی۔ جو کچھ تھوڑا بہت کیا وہ دوستوں نے کیا، لیکن اس پرآشوب زمانے میں وہ بھی بیچارے جیسا کرنا چاہتے ویسا نہیں کر سکتے تھے۔ بہرحال میراجی مر گئے۔ بہت افسوس ہے کہ میراجی مر گئے۔ میراجی بری حالت میں مرے۔ اس کا بھی بہت افسوس ہے۔ لیکن سب سے بڑا افسوس اس بات کا ہے کہ میراجی کے ساتھ ایک دُنیا ختم ہو گئی۔ ایک مخصوص رُجحان ختم ہو گیا۔ ایک انداز ختم ہو گیا۔ ایک ارادہ ختم ہو گیا ایک تحریک ختم ہو گئی۔ کیونکہ ان کی شخصیت ایک دنیا، ایک رجحان، ایک ایک تحریک کی حیثیت رکھتی تھی۔

میں میراجی کی بڑائی کا قائل تھا، باوجود اس کے کہ میرے اور ان کے درمیان نظریاتی

اختلافات کی خلیج حائل تھی۔ میں آج بھی ان کی بڑائی کا قائل ہوں حالانکہ ان کے فلسفۂ زندگی اور زاویۂ نظر سے نظریاتی اختلاف مجھے آج بھی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کے ایک بڑے شاعر اور نقاد ہونے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔

اسی وجہ سے مجھے رہ رہ کر یہ خیال آتا ہے کہ میراجی مرجانے کے باوجود مرے نہیں وہ زندہ ہیں کیونکہ انہوں نے اردو شاعری کو ایک نیا آہنگ دیا ہے۔ نئی تکنیک دی ہے۔ نئے موضوعات سے اس کو روشناس کیا ہے۔ انہوں نے ہندی کی مدھر بحریں اپنائی ہیں۔ ہندی کی شیرینی اور گھلاوٹ کو اردو کے قالب میں ڈھالا ہے یا اردو کو ہندی کی شیرینی اور گھلاوٹ کے سانچے میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔ معنوی اعتبار سے بھی ان کی شاعری میں ہندی کے اثرات نظر آتے ہیں۔ اور ان کی اسی خصوصیت نے انہیں اس رجحان کے سلسلے کی دوسری کڑی بنا دیا ہے جس کے علمبردار عظمت اللہ خان تھے اور جن کے سُریلے بول آج بھی ہمارے کانوں میں گونجتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ عظمت اللہ خاں کے موضوعات محدود تھے۔ میراجی ان موضوعات سے بہت آگے بڑھے ہیں۔ انہوں نے اپنے دامن کو وسیع کیا ہے۔ ان کی شاعری کا ایک اہم موضوع، زندگی ہے، اور زندگی کے جنسی پہلو پر وہ خوب لکھتے ہیں۔ لیکن زندگی کے دوسرے پہلوؤں کو بھی انہوں نے نظر انداز نہیں کیا ہے۔ ان کی شاعری میں آفاقیت کی جو خصوصیت ہے، اس نے اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زندہ کر دیا ہے۔ ان کے یہاں کچھ الجھنیں ضرور ہیں بعض ایسی باتیں بھی ہیں جن کو سراہا نہیں جا سکتا لیکن اس کے باوجود مجموعی اعتبار سے دیکھا جائے، تو ان کی شاعری اپنی جگہ ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ ان پر فرانسیسی تمثیل نگاروں میں سے میلارمے، ریمبو اور بادلیئر کے اثرات بڑے گہرے تھے۔ چنانچہ ان کی شاعری میں نئی اشاریت اور نئی تمثیل نگاری کا استعمال قدم قدم پر پڑھنے والے کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ تمثیل نگاری انہیں ابہام کی طرف بھی لے جاتی ہے لیکن اس سلسلے میں بھی انہوں نے ایک نئی آن اور نئی شان کو اپنی شاعری میں پیدا کیا ہے۔ انہوں نے آزاد نظمیں لکھی ہیں۔ پابند نظمیں لکھی ہیں۔

گیت لکھے ہیں غزلیں لکھی ہیں، اوران سب میں ان کا ایک مخصوص رنگ جھلکتا ہے ۔ رطب ویابس ان سب میں ہے۔ لیکن ان سب کا انتخاب اُردو میں ہمیشہ زندہ رہنے کے لیے ہے۔ اسے کون مٹا سکتا ہے۔

اور پھر ان کی نثر اور خصوصیت کے ساتھ ان کی تنقید بھی کسی کم مرتبے کی مالک نہیں۔ میراجی کے قلم میں بڑی روانی تھی۔ وہ بڑی سادہ اور رواں نثر لکھتے تھے۔ ان کی نثر میں رنگین نہیں ہوتی تھی، لیکن ان کی سادگی ہی میں ایک پُرکاری تھی۔ تنقید میں ان کی نگاہیں دُور تک پہنچتی تھیں۔ شعر فہمی گویا ان کی گھٹی میں پڑی تھی اور اس خصوصیت نے ان کے تنقیدی شعور کی نشو ونما میں بڑا حصہ لیا تھا۔ وہ تنقید میں نفسیات کا خاص خیال رکھتے تھے۔ اور خصوصاً تحت شعور کے مسائل کی روشنی میں کسی تخلیق پر قلم اٹھانا ان کی سب سے نمایاں خصوصیت تھی۔ اس لحاظ سے انہوں نے اُردو تنقید میں بھی ایک اضافہ کیا۔ ہر چند وہ اس سلسلے میں کچھ زیادہ کام نہ کر سکے لیکن پھر بھی انہوں نے ایک ایسا چراغ روشن کیا جس کی روشنی سے آئندہ اور چراغ جلتے رہیں گے۔ میراجی کا زاویہ نظر تجزیاتی بھی ہوتا تھا اور تاثراتی بھی۔

میراجی کی موت کا خیال مجھے جب بھی آتا ہے، ان کی نظموں اور گیتوں کی یہ خصوصیات، ان کی تنقید کا یہ انداز اور نثر کی یہ صفات میری آنکھوں کے سامنے گھوم جاتی ہیں۔ اور وہ مجھ سے کہتی ہیں گویا مجھے یقین دلاتی ہیں کہ میراجی مرے نہیں، وہ مر نہیں سکتے۔ وہ تو ہمارے ساتھ زندہ ہیں اور ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

ناصر کاظمی

قیامِ پاکستان کے بعد جب میں دہلی سے لاہور آیا تو مجھے دو آدمی ایسے ملے جن کو میں کبھی بھول نہیں سکتا۔ ان میں سے ایک آدمی بہت بُرا تھا، ایک بہت اچھا۔ بُرے آدمی کا نام میں اس وقت لینا نہیں چاہتا، اور اس کی ضرورت بھی نہیں۔ ہاں اچھے آدمی کا نام میں لے سکتا ہوں۔ یہ اچھا آدمی ناصر کاظمی تھا۔ بُرا آدمی ابھی تک زندہ ہے لیکن اچھا آدمی ناصر کاظمی مر گیا، اور وقت سے بہت پہلے جوانی ہی میں اس دُنیا سے رُخصت ہو گیا۔ بُرا آدمی ناصر کاظمی کے نزدیک عجیب و غریب ہونے کی حد تک بُرا تھا۔ لیکن اپنے اچھے آدمی ہونے کے متعلق اُسے کوئی خوش فہمی نہیں تھی۔ یہ فیصلہ اس نے دوسروں پر چھوڑ دیا تھا۔ البتہ وہ اس موضوع پر اکثر دلچسپ، پہلودار اور معنویت سے بھرپور باتیں کیا کرتا تھا۔ اور اس کے دوست احباب خیر اور شر کے ان پہلوؤں پر اس کی اس گُل افشانیٔ گفتار سے لطف اندوز ہوتے تھے لیکن ان کی خاموشی زندگی کی اس صورتِ حال پر ماتم بھی کرتی تھی۔

ناصر کاظمی کو ایک شاعر کی حیثیت سے سب سے پہلے میرے دوست محمد حسن عسکری مرحوم نے دریافت کیا۔ ویسے ناصر کاظمی شاعری تو اپنی طالب علمی کے زمانے سے کرتا تھا، اسلامیہ کالج لاہور کے زمانے میں وہ اختر شیرانی اور حفیظ ہوشیار پوری وغیرہ کی صحبتوں میں رہا تھا اور اس زمانے کے شاعرانہ ماحول سے متاثر ہو کر اس نے غزلیں کہنی

شروع کر دی تھیں لیکن اس وقت ایک شاعر کی حیثیت سے اُسے کم لوگ جانتے تھے۔
قیامِ پاکستان کے بعد اس نے نئی تبدیلیوں کو اپنی غزلوں کا موضوع بنایا، اور ایک ایسے پاکستانی کے تجربات کو اس صنفِ لطیف کے سانچے میں ڈھالا جو اپنا سب کچھ لٹا کر ایک نئے وطن میں نہ صرف پناہ لینے بلکہ اس کو بنانے اور سنوارنے کے لیے داخل ہوا۔ لوگوں کو اس کی اس قسم کی شاعری نے چونکا دیا۔ عسکری صاحب بھی اس زمانے میں اس کی شاعری کو پڑھ کر چونکے۔ اور انہوں نے پاکستانیوں کو غزل کے افق پر اس نئے ابھرنے والے شاعر اور اس کی شاعری کے نئے رنگ و آہنگ کا احساس دلایا۔ اور لوگ واقعی اس سے متاثر ہوئے۔ عسکری صاحب کو یہ کام خوب آتا تھا۔ وہ جوہرِ قابل پر نظر رکھتے تھے اور نہ جانے کہاں کہاں سے ایسے لوگوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکال لاتے تھے جن کے اندر انہیں ذہانت و فطانت نظر آتی تھی۔ آج سے تقریباً تیس سال قبل انہوں نے ناصر کی شاعری کے بارے میں چند فقرے لکھے جن کا لُبِ لباب یہ تھا کہ ناصر کاظمی صحیح معنوں میں غزل کا پاکستانی شاعر ہے کیونکہ پاکستان کے بنیادی مسائل کی روح ناصر کاظمی کے کلام میں اس طرح گھل مل گئی ہے جس کی وجہ سے اس کا کلام پاکستانی مسائل کا آئینہ بن گیا ہے۔

اور واقعی جب میں نے عسکری صاحب کے یہ فقرے پڑھ کر ناصر کاظمی کے کلام کا مطالعہ کیا تو مجھے عسکری صاحب کے ان خیالات میں بڑی صداقت نظر آئی۔ میں نے اس آئینے میں پاکستان کا نظارہ کیا۔ اس وطنِ عزیز سے جو والہانہ محبت ناصر کاظمی کو تھی، اس کا جلوۂ صد رنگ دیکھا، یہ مقدس سرزمین اس زمانے میں جن حالات سے دوچار تھی، اس کی صحیح تصویر اس میں مجھے دکھائی دی۔ افراد کا غم ان کی مصیبتیں، آگ اور خون کے طوفان، قتل و غارت گری، شکست و ریخت، لیکن اس کے باوجود ایک طمانیت اور تحفظ کا احساس، کچھ کرنے کی آرزو، آگے بڑھنے کی خواہش، غرض یہ کہ ایسے تمام پہلوؤں کے نقوش مجھے اس کے کلام میں نظر آئے۔

اور ایمان کی بات یہ ہے کہ مجھے ذاتی طور پر اُس کے کلام کو پڑھ کر ایک طمانیت

سی نصیب ہوئی اور جو کاری زخم اس وقت کے حالات نے میرے جسم اور روح پر لگائے تھے، اُن کے لیے ناصر کے کلام نے مرہم کا کام کیا۔ اور میرے دل میں زندہ رہنے اور کچھ کرنے کے خیال کی شمع سی فروزاں ہوئی۔ اور میں نے ناصر کاظمی کے بارے میں ایک بار نہیں کئی بار تحریر و تقریر دونوں میں اپنے انہی تاثرات کا اظہار کیا۔ یہ بات ناصر کاظمی کے بعض ہم عصروں کو ناگوار گزری لیکن ناصر کاظمی ان تاثرات کو پڑھ کر بہت خوش ہوا۔

جب میں اس سے کوئی تیس سال قبل لاہور میں پہلی دفعہ ملا تو اس نے سب سے پہلے مجھ سے اس کا ذکر کیا۔

کہنے لگا "آپ سے بعض لوگ بہت ناراض ہیں۔ بڑی تکلیف ہے بیچاروں کو۔"

میں نے کہا "کیوں؟ میں نے تو کوئی ایسی بات نہیں کی۔"

ناصر نے کہا "اس لیے کہ آپ نے میرے بارے میں بعض اچھی اور صحیح باتیں کہی ہیں۔ یہ باتیں میرے بعض ہم عصروں کو بہت ناگوار گذری ہیں۔ آپ جانتے ہیں عبادت صاحب! ہم عصروں میں چشمک تو ہوتی ہی ہے خیر یہ تو کوئی ایسی بڑی بات نہیں۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ بعض لوگ ہمارے آس پاس بہت چھوٹے ہیں۔ انہیں آپ کم ظرف کہہ سکتے ہیں۔"

میں نے کہا "میں بالکل نہیں سمجھا۔"

کہنے لگے "بعض لوگ یہ شکایت کرتے ہیں کہ آپ ان کے بارے میں کیوں نہیں لکھتے۔ ان کی تعریف کیوں نہیں کرتے؟"

میں نے کہا "ان سے کہیئے اس لیے کہ میں آپ کے بارے میں لکھتا ہوں، آپ کی تعریف کرتا ہوں۔ وہ مجھے متاثر نہیں کرتے۔"

میرا یہ جواب سُن کر ناصر کاظمی دیر تک نہ جانے کیا کیا کہتا رہا۔ نہ جانے کتنی باتیں کرتا رہا۔ میں اس کی باتوں کو سُنتا رہا۔ کچھ باتیں میری سمجھ میں آئیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آئیں۔ کہیں ان باتوں سے اس وقت کے ادبی ماحول اور اس ماحول میں معاصرین

کی چشمکوں کا کچھ حال مجھے ضرور معلوم ہو گیا۔

میں اس وقت لاہور میں نووارد تھا۔ اس لیے اس کی یہ باتیں مجھے مفید معلوم ہوئیں۔
اس پہلی ملاقات میں، جو غالباً اورینٹل کالج میں ہوئی، وہ کوئی ڈیڑھ گھنٹے تک مجھ سے باتیں کرتا رہا۔ اس کی باتیں نہایت دلچسپ اور خیال انگیز تھیں، ورنہ میں ڈیڑھ گھنٹے تک کسی ایک شخص کی باتوں کو برداشت نہیں کر سکتا۔ اور مسلسل ڈیڑھ گھنٹے تک ایک جگہ بیٹھ کر باتیں کرنا ناصر کاظمی کے بس کی بات بھی نہیں تھی۔

میں نے اس کے بارے میں یہی سُن رکھا تھا کہ وہ جم کر کسی جگہ نہیں بیٹھتا۔ موڈ ہو تو باتیں کرتا ہے اور بہت اچھی باتیں کرتا ہے۔ لیکن چند منٹ کے بعد کسی نہ کسی بہانے سے اٹھ کر بھاگ جاتا ہے۔

خیر تو اس دن مجھے ناصر کاظمی سے مل کر اور اُس کی باتیں سُن کر بے حد خوشی ہوئی۔ کیونکہ میں نے سب سے پہلے تو اُس کی باتوں سے یہ محسوس کیا کہ وہ ایک اچھا آدمی ہے، ایک سچّا پاکستانی ہے، اور اپنے اس وطن عزیز سے بے حد محبت کرتا ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ کسی کی بُرائی نہیں کرتا بلکہ کسی کی بُرائی کو اس کی انسانی کمزوری سے تعبیر کرتا ہے تیسرے یہ کہ زندگی اور اس کے معاملات و مسائل کے بارے میں اس کا زاویۂ نظر تعمیری ہے اور چوتھے یہ کہ وہ حد درجہ روشن خیال ہے۔

اس لیے ناصر کاظمی سے میری دوستی ہو گئی۔ یہ اور بات ہے کہ اُس نے زندگی بھر مجھے ایک دوست سے زیادہ اپنا بزرگ ہی سمجھا۔ وہ بلا مبالغہ مجھ سے سینکڑوں بار مِلا لیکن اس نے کبھی مجھ سے بے تکلّف ہونے کی کوشش نہیں کی۔ ہمیشہ احترام کے خیال کو باقی رکھا۔ ادب آداب اور تہذیب و شائستگی کو کبھی بھی اس نے ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اور اس کی یہ ادا مجھے ایسی بھائی کہ میں بھی اُسے ہمیشہ اپنے چھوٹوں کی طرح سمجھتا رہا۔ میں نے ہمیشہ اس کی دلدہی کی اور جب بھی اُسے کسی اُلجھن کا سامنا کرنا پڑا یا کوئی مسئلہ پیش آیا تو میں نے اس کو اپنی بساط بھر سُلجھانے کی کوشش کی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ناصر کاظمی آگ اور خون کے ایک دریا کو عبور کر کے لاہور میں اپنے خاندان کے ساتھ داخل ہوا تھا۔ پاکستان بننے سے قبل وہ لاہور میں طالب علم تھا۔ اور اس کے خاندان کے تمام لوگ انبالہ میں تھے۔ پاکستان بنا تو وہ اپنے خاندان کے ساتھ رفیوجی ہو کر لاہور میں داخل ہوا۔ اب اس کی نفسیات مختلف ہو گئی تھی۔ حالات نے اس کے مزاج میں نمایاں تغیّر پیدا کر دیا تھا، اس نے گھروں کو لٹتے، انسانوں کو قتل ہوتے، بوڑھوں، جوانوں اور بچوں کو خاک و خون میں لوٹتے، بستیوں کو اُجڑتے اور شہروں کو ویران ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ نہ جانے کتنی قیامتیں اس کی آنکھوں کے سامنے گذری تھیں۔ ان سب کے نقوش اس کے دل و دماغ اور حواس پر اس طرح ثبت ہوئے تھے کہ اس کی شخصیت کا جُز بن گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ تمام تجربات اس کی شاعری میں نمایاں ہونے لگے اور اُس تقسیم کے بعد افراد جس آشوبِ قیامت سے دوچار ہوئے تھے، اس کے مختلف پہلوؤں کو ناصر نے اپنی شاعری میں سمو دیا۔

ظاہر ہے کہ مجھے ناصر کاظمی کی شاعری کے اس رجحان سے دلچسپی پیدا ہوئی کیونکہ میں نے یہ محسوس کیا کہ اس انقلاب کی تفصیل صرف تاریخ ہی میں نہیں شاعری میں بھی آنی چاہیئے تاکہ جو لوگ اس آشوبِ قیامت سے دوچار ہوئے ہیں ان کی ذہنی اور جذباتی کیفیت کا اندازہ بھی ہو سکے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب لاہور شہر میں ہر چیز اکھڑی ہوئی تھی۔ قافلے پر قافلے آ رہے تھے۔ لُٹے پِٹے قافلے۔ بہیمیت اور بربریت کے جہنّم سے نکل کر ایک نئی مملکت میں داخل ہو رہے تھے جہاں انہیں کم از کم یہ اطمینان ضرور تھا کہ جس مملکت میں وہ داخل ہو رہے ہیں، وہ انہوں نے خود بنائی ہے، اور وہ اس میں محفوظ ہیں۔ لیکن اس احساسِ طمانیت کے باوجود زندگی میں ایک انتشار تھا۔ نظم و ضبط کی کیفیت مفقود تھی۔ چنانچہ حسّاس لوگ، خصوصیت کے ساتھ ادیب، شاعر اور فنکار اس زمانے میں باہم مل بیٹھنے کے لیے وقت نکال لیتے تھے، اور اس طرح غم غلط کرتے تھے۔

ایسی صحبتوں میں ناصر کاظمی بھی شریک ہوتا تھا، چنانچہ اس زمانے میں میری اس سے تقریباً روزانہ کہیں نہ کہیں ملاقات ہو جاتی تھی اور بے شمار پہلوؤں پر تبادلۂ خیال ہوتا تھا۔

بظاہر اس زمانے میں ناصر کاظمی خاموش رہنے والا ایک پریشان حال نوجوان نظر آتا تھا، لیکن ان محفلوں میں، جب وہ موڈ میں ہو، اور اس کو ذرا چھیڑ دیا جائے تو اس کی طبیعت رواں ہو جاتی تھی اور وہ تخلیق آدم سے موجودہ دور تک کے مظاہر، مناظر اور مسائل پر اظہار خیال کرتا تھا۔ سورج کی گرمی اور روشنی چاند کی ٹھنڈک اور چاندنی کی لطیف مسکراہٹ، درختوں کی ہریالی، مٹی کی سوندھی خوشبو، دوب کی مہک، پکی ہوئی روٹی سے نکلتی ہوئی گندم کی اشتہا انگیز خوشبو، حسن و شباب کی دلکشی، نسوانی حسن کی دلنشینی لیکن ساتھ ہی انسان کی محرومی، اس کی زبوں حالی، معاشرتی بدحالی، معاشی ناہمواری، سرمایہ داروں کی سیاست گری، مزدوروں کی پامالی، ادب و شعر اور فنون لطیفہ کی خواری تک نہ جانے کتنے ہی موضوعات پر وہ نئی اور اچھوتی باتیں کرتا تھا۔

معمول یہ تھا کہ ہم اکثر شام کو کسی ریستوران میں ملتے اور اس طرح کی بے شمار باتیں ہوتیں۔ میں خود کم بولتا۔ البتہ کوئی موضوع چھیڑ دیتا تاکہ ناصر کاظمی ذرا موڈ میں آجائے، اور اس کی دلچسپ باتوں کا سلسلہ شروع ہو چنانچہ گھنٹوں ان باتوں کا سلسلہ جاری رہتا۔ اور احباب ناصر کاظمی کی دلچسپ باتوں سے لطف اندوز ہوتے۔ ناصر کا محبوب مشغلہ ایک زمانے میں یہی تھا کہ وہ دوپہر کے بعد گھر سے نکلتا۔ مال روڈ پر آتا۔ ایک ریستوران میں بیٹھتا، پھر دوسرے میں چلا جاتا، پھر تیسرے میں جا بیٹھتا۔ کبھی ایک گروپ کے ساتھ کبھی دوسرے گروپ کے ساتھ، ہر ایک سے اس کے مزاج کے مطابق باتیں کرتا۔ پھر جب رات ہو جاتی تو وہ شہر نوردی کے لیے نکلتا اور لاہور کی جگمگاتی جاگتی سڑکوں پر آوارہ پھرتا۔ اور پھر رات گئے گھر واپس پہنچتا۔

ناصر اکثر مجھ سے یہ کہتا تھا کہ "مل بیٹھنے اور باتیں کرنے سے بے شمار خیالات پیدا ہوتے ہیں اور خیالات پر جلا بھی ہوتی ہے۔ اگر میں احباب سے نہ ملوں، باتیں نہ کروں،

شہر کی سڑکوں کے چکّر نہ کاٹوں تو میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ تخلیقی کام نہیں کر سکتا۔ شعر نہیں کہہ سکتا۔ تخلیقی کام کرنا اور شعر کہنا بھی ایک اجتماعی عمل ہے حالانکہ بظاہر وہ ایک فرد کا کام نظر آتا ہے۔"

ایک دن میں نے ناصر سے کہا "تمہارا زیادہ وقت ان ریستورانوں ہی میں گزرتا ہے۔ طرح طرح کے لوگوں سے تمہاری باتیں ہوتی ہیں۔ وقت خاصا ضائع ہو جاتا ہے۔"

ناصر کہنے لگا "بات ٹھیک ہے لیکن میرے لیے تو یہ ریستوران میرے ڈرائنگ روم ہیں۔ کیونکہ میرے گھر میں کوئی ڈرائنگ روم نہیں ہے۔ اس لیے میں ڈرائنگ روم کی طرح ٹی ہاؤس، کافی ہاؤس، یا چینیز لنچ ہوم میں بیٹھا ہوں۔ ڈرائنگ روم میں بھی یہ مزہ کہاں ہے۔ یہاں تو ہر طرح کے لوگ آجاتے ہیں۔ آسانی سے یہاں پہنچ جاتے ہیں۔ اور ان سے باتیں بھی ہو جاتی ہیں۔ اور باتیں کرنا ایک فن ہے۔ عبادت صاحب! اب دیکھیے نا کہ سقراط اتنا بڑا فلسفی تھا لیکن وہ صرف باتیں کرتا تھا۔ اور اس کی باتوں میں حکمت ہوتی تھی فلسفہ ہوتا تھا۔ حیات و کائنات کے اسرار و رموز ہوتے تھے۔"

میں نے کہا "بات صحیح ہے۔ واقعی باتیں کرنا ایک فن ہے اور انسان کا بہترین مشغلہ۔ شاید اسی لیے گپ نے دن کی روایت ہماری تہذیب کا ایک اہم حصّہ رہی ہے۔"

ناصر بولا "عبادت صاحب! کیا بات کہی ہے آپ نے۔ گپ تو ہمارے ہاں ایک اہم تہذیبی روایت کی حیثیت رکھتی ہے۔"

میں نے اس کے خیال سے اتفاق کیا اور گپ شروع کر دی۔ اور وہ بھی گپ کے طور پر نہ جانے کیا کیا کچھ کہنے لگا۔

ایک شام پاک ٹی ہاؤس میں اس سے مُلاقات ہوئی۔ دیر تک گپ ہوتی رہی پھر پان کھانے کے بہانے سے مجھے لے کر باہر نکلا۔ ہم نے پان کھائے۔

اس وقت رات کے نو بج چکے تھے۔

ناصر کہنے لگا "آج آپ میرے ساتھ چلیے۔ شہر کی سیر کرتے ہیں۔ دیکھیے اب

ہنگامہ ختم ہوگیا۔ سڑکیں خاموش ہوچکی ہیں، لوگ اپنے اپنے گھروں کو جاچکے ہیں۔ بس مجھے یہی وقت اچھا لگتا ہے۔ لوگ سو جاتے ہیں، شہر جاگتا ہے۔"

میں اُس کی یہ دلچسپ باتیں سُنتا ہوا، اس کے ساتھ ہولیا، اور مال روڈ پر چلنے لگا۔ ناصر آس پاس کی نہ جانے کتنی سڑکوں پر کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے تک گھومتا رہا۔

بالآخر میں نے کہا "میں تو تھک گیا۔"

ناصر کہنے لگا "میری سیر تو اب شروع ہوئی ہے۔"

گیارہ بجے کے قریب میں نے اُس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اور وہ مجھ سے یہ کہہ کر رخصت ہوا کہ میں تو کوئی ایک بجے تک گھر پہنچوں گا۔"

اور ناصر کاظمی کا روزانہ کا یہی معمول تھا کہ وہ جاگتے ہوئے شہر کے ساتھ خود بھی جاگتا تھا، اور رات گئے تک سڑکوں اور گلیوں کا طواف کرتا تھا۔

ناصر کاظمی زندگی، حُسن اور فن کا شیدائی تھا۔ انسانی زندگی اس کے نزدیک خود ایک فن تھی جس کی بنیاد وہ حسن کو سمجھتا تھا۔ وہ ہمیشہ یہ کہتا تھا کہ زندگی حُسن ہے اور حسن زندگی۔ اور انسان اس حُسن کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ حصُولِ حُسن سے اُسے مسرّت حاصل ہوتی ہے اور مسرّت کا حصول ہی انسان کا نصب العین ہے۔ یہ مسرّت انسان زندگی کی چھوٹی چھوٹی چیزوں سے بھی حاصل کرتا ہے۔ مسرت کا دائرہ بہت وسیع ہے۔

ایک دن باتوں باتوں میں کہنے لگا، "عبادت صاحب! جب روٹی پکتی ہے اور اس میں سے گندم کی جو خوشبو نکلتی ہے، اس کو آپ نے کبھی محسوس کیا ہے؟"

میں نے کہا "بارہا۔"

پھر کہنے لگا "جب گھاس کاٹی جاتی ہے اور اس میں سے دوب کی جو مہک آتی ہے کیا آپ نے اس کو سونگھا ہے؟"

میں نے کہا "اکثر۔"

پھر کہنے لگا "دال جب بگھاری جاتی ہے اور اس وقت جو خوشبو سارے گھر

میں پھیلتی ہے اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟
میں نے کہا "کسی اور خوشبو میں وہ بات نہیں"
پھر ایک روز بیٹھے بیٹھے کہنے لگا "ماش کی دال بڑی ہی حسین چیز ہے۔ خاص طور پہ اس کی سفیدی۔ پکنے کے بعد بھی اس کا ایک ایک دانہ الگ ہوتا ہے، اور جب وہ خالص گھی سے بگھاری جاتی ہے اور جب گندم کی تازہ چپاتی کے ساتھ کھایئے تو عجیب لطف آتا ہے"
میں نے کہا "مجھے بھی اچھی لگتی ہے۔ واقعی خوب چیز ہے!"
پھر ایک دن مجھ سے کہنے لگا "لوگ اب ستاروں کو نہیں دیکھتے۔ چاند سے لطف اندوز نہیں ہوتے، چاندنی کے حسن کو محسوس نہیں کرتے۔ گل پھول سے رابطہ نہیں رکھتے۔ عجیب زمانہ آیا ہے۔ لوگ گھروں میں گھسے بیٹھے رہتے ہیں۔ باہر نہیں نکلتے۔ خدا جانے انہیں کیا ہو گیا ہے۔ میں تو جب تک عبادت صاحب! ان سب چیزوں سے رابطہ نہ رکھوں مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہوا میں معلّق ہوں"
میں نے کہا "لوگ آج کل اپنے آپ میں زیادہ گم ہیں۔ انہیں اپنے مسائل سے اتنی فرصت ہی کہاں ہے کہ ان چیزوں سے لطف اندوز ہوں"
ایک دن ناصر کاظمی میرے پاس اورینٹل کالج میں آیا اور کہنے لگا "غضب ہو گیا۔ گورنمنٹ کالج کے آس پاس والی سڑکوں پہ درختوں کا قتل عام ہو رہا ہے۔ یہ درخت کئی کئی سو سال پرانے تھے، مجھے دکھ ہوا۔ سوچا آپ کو اس دکھ میں شریک کرتا چلوں"۔
میں نے کہا "کاٹنے والوں سے پوچھا نہیں کہ وہ یہ قتل عام کیوں کر رہے ہیں؟"
ناصر بولا "میں نے پوچھا تھا۔ جواب ملا سڑکیں چوڑی کر رہے ہیں۔ اب اس شہر میں سڑکیں چوڑی ہو جائیں گی۔ درخت نہیں ہوں گے"
غرض ہم نے مل کر خاصی دیر تک اس المیہ پہ آہ و زاری کی لیکن کچھ نہ کر سکے۔
ناصر کو میں نے اس روز بہت اداس دیکھا۔

غرض ناصر کاظمی بڑے ہی لطیف اور نفیس مزاج کا آدمی تھا، اور حسن و جمال کا بڑا ہی رچا ہوا ذوق رکھتا تھا۔ اس ذوق کو ذرا بھی ٹھیس لگے تو وہ بے چین ہو جاتا تھا، ورنہ وہ حسن کی انہی سہانی دُنیاؤں میں بسیرا کرتا تھا۔ زندگی کو حسین بنانے کی تمنا ہر لمحہ اس کے دل میں طوفان سا برپا رکھتی تھی۔

اور اُس کی زندگی اور فن دونوں میں اس کیفیت کا عکس نظر آتا ہے۔

لیکن انسانی زندگی بڑی ہی ظالم اور یہ زمانہ بڑا ہی جابر ہے۔ وہ ایک ایسے انسان سے بھی جو حسن کا پرستار، لطیف چیزوں کا شیدائی اور ادب اور فنونِ لطیفہ میں ڈوبا ہوا ہو، وہ سب کچھ کرواتا ہے جس کے تصوّر سے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ناصر کاظمی کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ وہ صرف شاعر، فن کار اور حسن کا پرستار تھا لیکن پیٹ کے دوزخ کو بھرنے کے لیے اس کو کئی ایسے کام کرنے پڑے جو اس کے لطیف مزاج کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتے تھے۔ کئی ایسی ملازمتیں کرنی پڑیں جن سے وہ مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ اور ایسے لوگوں سے تعلقات پیدا کرنے پڑے جن سے ان کا کوئی ذہنی رابطہ نہیں تھا۔ کبھی اس نے بتایا کہ آج کل وہ محکمۂ زراعت میں ملازم ہے اور زراعت کا کوئی رسالہ مرتب کر رہا ہے۔ کبھی اُس نے یہ خبر سُنائی کہ یہ ملازمت اس نے چھوڑ دی ہے، اور اب کسی جاننے والے نے بنیادی جمہوریت کے کسی دفتر میں اسے ملازم کروا دیا ہے۔ وہاں وہ مضامین اور فیچر لکھتا اور لکھواتا ہے۔ کبھی اُس نے یہ اطلاع دی کہ اب وہ ریڈیو میں ملازم ہے اور فیچر وغیرہ لکھنے کا کام اُس کے سُپرد ہے۔ یہ کام ناصر کاظمی تن دہی سے کرتا تو تھا لیکن ایمان کی بات یہ ہے کہ اس قسم کے کام اس کے مزاج کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتے تھے۔ پھر بھی اس کے باوجود وہ یہ کام کرتا رہا لیکن اس قسم کی بے تُکی مصروفیات اُسے گھُن کی طرح کھاتی رہیں۔ لیکن اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا مظاہرہ اس نے ان کاموں میں بھی کیا۔ بڑی بات یہ ہے کہ اس نے کسی کے سامنے اس قسم کے غیر دلچسپ کاموں کا رونا نہیں رویا۔ شکایت نہیں کی۔ بلکہ جب بھی ذکر آیا تو اُس نے ہمیشہ یہی کہا کہ کام خوش اسلوبی سے چل رہا ہے۔

یہ اس کی عالی ظرفی تھی کہ اس نے کبھی ان کاموں سے اپنی بیزاری کا اظہار نہیں کیا۔

ناصر کاظمی ایک ادبی آدمی تھا، اور اس کا خیال تھا کہ ادبی کام کرنے کے لیے ادبی رسالوں سے رابطہ رکھنا ضروری ہے۔ اسی خیال نے اسے ادبی رسالوں کی طرف راغب کیا اور اُس نے اپنی مختصر سی زندگی میں کئی رسالے نکالے۔ اور اس طرح ان رسالوں سے ادب کی نئی تحریکوں اور نئے ادبی رُجحانات کی آبیاری کی۔ اُس کے دل میں ایک لہر سی اُٹھتی تھی، اور وہ ادبی رسالہ نکالنے کا منصوبہ بنا لیتا تھا۔ ”اوراق“، اُس نے اسی طرح نکالا۔ ”خیال“ سے وہ اسی طرح وابستہ ہوا۔ ’ہمایوں‘ میں اس نے اسی خیال کے تحت ملازمت کی۔ جو رسالے اس نے خود نکالے ان کی مالی حالت، ظاہر ہے کہ اچھی نہیں تھی۔ اس لیے وہ دوستوں تک سے پیسے لینے میں تکلف نہیں کرتا تھا۔ ان حالات میں اُس کے رسالے صرف چند مہینے زندہ رہ سکتے تھے۔ ہمایوں کو وہ نئے سانچے میں ڈھالنا چاہتا تھا لیکن اس کے مالک اور اڈیٹر میاں بشیر احمد مرحوم، اگرچہ اس کا بہت خیال رکھتے تھے، لیکن اُن کے مزاج میں جو ایک خاص طرح کی احتیاط تھی، اس نے ناصر کو اس کی اجازت نہیں دی کہ وہ ہمایوں کے مخصوص روایتی انداز کو بدل دے۔ وہ میاں صاحب کے حُسنِ اخلاق کی ہمیشہ تعریف کرتا تھا، وہ بڑے احترام سے ان کا نام لیتا تھا۔ لیکن اس کی باتوں کی تان ہمیشہ اس خیال پر ٹوٹتی تھی کہ اس ماحول میں گھٹن بہت ہے۔ غرض وہ کئی سال ہمایوں میں رہنے کے باوجود اس کے مزاج کے ساتھ مطابقت پیدا نہ کر سکا، اور بالآخر میاں صاحب ہمایوں کو بند کرنے پر مجبور ہو گئے۔

دراصل بات یہ ہے کہ ناصر کاظمی میں ایک انقلابی کی روح تھی، اور اس انقلابی روح کا اظہار اُس کے قول و فعل دونوں میں ہوتا تھا۔ اس پر ہمیشہ ایک اضطرابی کیفیت طاری رہتی تھی۔ وہ ہر وقت ایک بے چینی کے عالم میں نظر آتا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ زندگی بھر اپنے ماحول سے مطابقت پیدا نہ کر سکا۔ اس کے آس پاس اور گرد و پیش زندگی کی جو کیفیت تھی وہ اس کے مزاج کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتی تھی۔ یہی وجہ

ہے کہ وہ کسی ایک جگہ سکون سے بیٹھ نہیں سکتا تھا۔ لگ کر کوئی کام نہیں کر سکتا تھا۔ وہ تو خواب دیکھتا تھا، اور یہ خواب اسے بے چین رکھتے تھے۔ وہ ایک بچے کی طرح ہمکتا تھا اور خوابوں میں جو کچھ اسے نظر آتا تھا اُس کو گرفت میں لینے کے لیے ان کی طرف دوڑتا تھا۔ وہ زندگی بھر دوڑتا ہی رہا۔ اس کا تخیل اُسے نہ جانے کہاں کہاں لیے پھرتا تھا۔ جینیس" کی یہ تمام خصوصیات اس میں موجود تھیں۔

لیکن وہ حد درجہ شائستہ، مہذّب اور وضع دار شخص تھا۔ اُس میں بڑی انسانیت تھی۔ وہ حفظ مراتب کا بہت خیال رکھتا تھا۔ ہر شخص سے اچھی طرح ملتا تھا۔ ہر شخص کی عزّت کرتا تھا۔ اُس نے کبھی کسی کی توہین نہیں کی۔ عفو و درگذر اس کے مزاج کی بڑی اہم خصوصیت تھی۔ وہ ہر شخص کا دوست تھا اور کسی سے دشمنی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ دشمن تک سے دشمنی کرنے کا قائل نہیں تھا۔ لیکن اس کا دشمن کوئی نہیں تھا۔ اس کی نیکی اور شرافت دشمن کو بھی اپنا دوست سمجھتی تھی۔

لاہور کے حلقۂ ارباب ذوق کی تاریخ میں یہ ریکارڈ موجود ہے کہ چند لوگوں نے ناصر کاظمی اور اس کے دو تین ساتھیوں کو حلقے سے خارج کر دیا۔ الزام غالباً یہ تھا کہ حلقے میں گروپ بندی کی فضا پیدا ہو گئی ہے، اور اس فضا کو اس طرح ختم کیا جا سکتا ہے کہ چند لوگوں کو حلقے سے خارج کر دیا جائے۔ ناصر کاظمی کو معلوم تھا کہ یہ فیصلہ ہی گروپ بندی کا نتیجہ ہے۔ اس زمانے میں ناصر کاظمی پابندی سے حلقے کے جلسوں میں شرکت کیا کرتا تھا اور اچھی اچھی غزلیں پیش کرتا تھا۔ ان غزلوں پہ تنقید کم ہوتی تھی، حاضرین ان کی تعریف زیادہ کرتے تھے یہ بات اس کے بعض معاصرین کو بہت ناگوار گزری، اور انہوں نے اس پر اس طرح حلقے کے دروازے بند کرنے کی کوشش کی۔ ناصر کے احباب کو اس پر بہت غصہ آیا۔ لیکن ناصر پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

یہ خبر سُن کر ایک دن وہ مجھ سے کہنے لگا، عبادت صاحب! یہ بہت چھوٹے لوگ ہیں۔ بونے ہیں بونے۔ ان کا قد اتنا چھوٹا ہے کہ یہ لوگ مضحکہ خیز نظر آتے ہیں۔ ان

کے لیے دعائے خیر کیجیے۔"

میں خاموش رہا، اور یہ سوچتا رہا کہ یہ شخص کتنا بے نیاز ہے۔ اس میں کتنی انسانیت ہے اور یہ کس درجہ مہذب اور شائستہ ہے۔

انسان کی کمزوریوں کو نظر انداز کر دینا ناصر کاظمی کا مسلک تھا۔

ایک واقعہ مجھے اور یاد آیا۔

جب ناصر کا پہلا مجموعہ کلام "برگ نے" چھپ کر پریس سے نکلا، تو وہ اس کی پہلی کاپی لے کر میرے پاس آیا۔ ابھی اس کی جلد بھی نہیں بندھی تھی، لیکن وہ فرطِ شوق سے اتنا بے چین اور بیقرار ہوا کہ وہ اپنے مجموعے کی یہ پہلی کاپی لے کر میرے پاس پہنچ گیا۔

اور کہنے لگا "عبادت صاحب! میری کتاب چھپ گئی ہے۔ سوچا سب سے پہلے آپ کو دکھاؤں"۔

میں نے کتاب اس سے لے لی۔ اس کو بار بار پڑھا۔ جی خوش ہوا۔ ناصر کو مبارکباد دی۔ احباب سے اس کے بارے میں باتیں کیں۔ طالب علموں سے اس نئے شعری مجموعے کا تذکرہ کیا۔ اور انہی دنوں ریڈیو پر نئی کتابوں پر جو تبصرہ میں کر رہا تھا، اس میں میں نے اس کتاب کو بھی شامل کر لیا۔ اور ذوق و شوق سے اس پر تبصرہ لکھا۔ اور ناصر کی خوب تعریف کی۔

یہ تعریف اس کے بعض ہم عصروں کو بہت ناگوار گذری اور انہوں نے ایک مقامی اخبار میں اس مضمون کا ایک خط چھپوا دیا کہ کتاب تو ابھی بازار میں آئی نہیں لیکن ناصر نے اُس پر پہلے سے تبصرہ لکھوا لیا۔ یہ خط صرف اس خیال سے چھپوایا گیا تھا کہ ناصر کی پوزیشن خراب ہو، اور تبصرہ نگار بھی بدنام ہو۔

ناصر یہ خط لے کر میرے پاس آیا، اور مجھے مزے لے لے کر ساری روداد سنائی۔ اُس پر اس واقعے کا کوئی اثر نہیں تھا۔ میں نے اس کے ماتھے پر شکن تک نہیں دیکھی۔ اور وہ یہی کہتا رہا کہ "آپ ان لوگوں کی پروا نہ کیجیے۔ یہ بہت چھوٹے لوگ ہیں۔ ان کی بار و د ختم ہو

چکی ہے۔ مجھے تو ان لوگوں پر ترس آتا ہے۔ میں ان کے ساتھ ہمدردی کرتا ہوں "

اور میں یہ سوچتا رہا کہ اس شخص میں کتنا ضبط و تحمّل ہے اور عفو و درگذر کی خصوصیت اس کے اندر کس قدر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔

اس کے علاوہ ایک اور واقعہ مجھے کسی طرح نہیں بھولتا۔

ناصر نے ایک شام مجھے انتظار حسین اور کچھ چند دوسرے احباب کو اپنے گھر پر چائے کی دعوت دی۔ میں نے وعدہ کر لیا۔ سہ پہر کو ہم لوگ اس کے گھر کرشن نگر پہنچے۔ تھوڑی دیر میں چائے آگئی، ہم لوگ دلچسپ باتیں کرتے اور چائے سے لطف لیتے رہے۔ ابھی ہم نے چائے کی پیالی ختم بھی نہیں کی تھی کہ ناصر کے کچھ پڑوسی آ گئے۔ انہیں آواز دے کر باہر بلایا اور زمین اور مکان کے الاٹمنٹ کے کسی مسئلے پر بحث شروع کر دی اور چند لمحوں میں اس بحث نے اچھے خاصے جھگڑے کی صورت اختیار کر لی۔ ان کی آوازیں اندر آنے لگیں۔ وہ لوگ بحالیات کے دفتر سے کوئی کاغذ لے آئے تھے اور ناصر کے مکان کے صحن کی کچھ زمین پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ ناصر نے انہیں بہت سمجھایا۔ اور کہا کہ اندر مہمان بیٹھے ہیں۔ اس معاملے کو کسی اور وقت طے کر لیں گے لیکن انہوں نے ایک نہ سُنی اور ہنگامہ کرنے پر تُل گئے۔

ہم لوگوں نے جب شور سُنا تو ہم بھی باہر پہنچے اور اُن لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ بحث مباحثے اور تو تو میں میں خاصا وقت گزر گیا۔ یہاں تک کہ شام ہوگئی۔ اندھیرا پھیل گیا۔ اس وقت کے قانون کے مطابق شام پڑنے اور اندھیرا چھا جانے کے بعد وہ قبضہ لینے کی کارروائی نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ انہیں واپس جانا پڑا۔ جن پولیس والوں کو وہ ساتھ لائے تھے وہی ان کو واپس لے گئے۔

جب وہ لوگ چلے گئے تو ہم ذرا چین سے بیٹھے اور اطمینان کا سانس لیا۔ اور باتیں شروع ہوئیں۔ ناصر کاظمی نے کلام بھی سُنایا۔ اس پر اس واقعے کا کوئی اثر نہیں تھا سوائے اس کے کہ مہمانوں کا پروگرام خراب ہوا۔ غصّہ اسے نام کو بھی نہیں آیا۔

بعد میں یہ معاملہ عدالت میں بھی گیا، اور اس سلسلے میں شہادت کے لیے مجھے اور انتظار کو بھی عدالت میں جانا پڑا۔ ہماری شہادت کو معتبر سمجھا گیا، اور کئی پیشیوں کے بعد مجسٹریٹ نے فیصلہ ناصر کے حق میں کیا۔

وہ لوگ شرمندہ ہوئے۔ ناصر نے انہیں معاف کر دیا۔

ناصر کے محبوب مشغلے تین تھے۔ ایک تو شہر کی سڑکوں پہ رات گئے تک گھومنا، دوسرے شعر و شاعری کا مطالعہ کرنا اور تیسرے کبوتر پالنا اور پرندوں سے دلچسپی لینا۔

شہر نوردی اس کے مزاج میں داخل تھی۔ وہ صحیح معنوں میں شہر کا آدمی تھا۔ گاؤں اور دیہات کی بات وہ بہت کم کرتا تھا۔ کیونکہ اس ماحول سے اُسے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ وہ ہمیشہ شہروں کی باتیں کرتا اور ان کی دلچسپیوں کا ذکر کرتا تھا۔ وہ روشنیوں کا عاشق تھا، اور یہ روشنیاں اُسے شہر ہی میں نظر آسکتی تھیں۔ اسی لیے وہ رات کی خوبصورتی کا ذکر اکثر مزے لے لے کر کرتا تھا۔

کہتا تھا "رات تو ایک دلہن کی طرح ہے، سجی سجائی، بنی بنائی، رات جاگتی ہے۔ رات میں شہر جاگتے ہیں، خاموشی جاگتی ہے، سکون جاگتا ہے۔ اسی لیے میں خود بھی جاگتا ہوں۔ رات کو تو جاگنا چاہیئے۔ لوگ اس کو سو کر ضائع کر دیتے ہیں، اور انہیں اس سے لطف اندوز ہونے کا موقع نہیں ملتا۔"

اور واقعی وہ راتوں کو جاگتا تھا، اور شہر کی سڑکوں اور بازاروں کا طواف کرتا تھا۔ اس کی زندگی کے بہترین لمحے یہی ہوتے تھے۔

پرندوں سے اُسے بڑی دلچسپی تھی۔ کہتا تھا "پرندے زندگی کی نشاندہی کرتے ہیں، اس کو دلچسپ بناتے ہیں۔ انسان کے لیے دلچسپی کا سامان پیدا کرتے ہیں۔ اُن کی آواز میں کتنا رس ہوتا ہے۔ ان کی پرواز میں کیسی رعنائی ہوتی ہے۔ وہ انسان کو جینا سکھاتے ہیں، زندہ رہنے کا درس دیتے ہیں۔ انسان ان سے بہت کچھ سیکھتا ہے اور صحیح معنوں میں انسان بن جاتا ہے۔

اور میں اس کی اس قسم کی باتوں سے خوب لطف لیتا تھا۔

ایک دن بیٹھے بیٹھے باتیں کرتے ہوئے کہنے لگا "لیکن عبادت صاحب! افضل ترین پرندہ کبوتر ہے آپ نے کبھی غور کیا ہے کس قدر معصوم جانور ہے۔ بڑی بوڑھیاں کہتی تھیں کبوتر سیّد ہے سیّد، اور اس کا مطلب یہی تھا کہ اس پرندے میں جو معصومیت اور پاکیزگی ہے وہ سیّدوں کی یاد تازہ کرتی ہے۔ پھر اس کی وفاداری بھی خاصے کی چیز ہے۔ اپنے گھر کو یاد رکھتا ہے، اپنے مالک کو پہچانتا ہے۔ جو پرندہ نامہ بری کے فرائض انجام دے اس کی عظمت سے بھلا کون انکار کر سکتا ہے۔ اس لیے میرے خیال میں ہر شخص کو کبوتروں سے رابطہ رکھنا چاہیئے۔ کبوتر پالنے چاہیئں۔ کبوتر انسانیت اور شرافت بھی تو سکھاتے ہیں۔ کسی کو نقصان نہیں پہنچاتے، کسی پر الزام نہیں لگاتے، بہتان نہیں تراشتے۔ بس اپنے آپ میں مگن رہتے ہیں۔ یہ کتنی بڑی بات ہے۔ لقا کبوتر کو دیکھئے، اس کا سر کبھی نہیں جھکتا، اس کا سینہ ہمیشہ تنا ہوا رہتا ہے۔ شیرازی کبوتر کو دیکھئے کیسی شان سے چلتا ہے۔ اس کے انداز میں کیسی رعنائی ہوتی ہے۔ میں نے اسی وجہ سے قسم قسم کے کبوتر پال رکھے ہیں۔ میرے لیے تو یہ کبوتر زندہ رہنے کا سہارا ہیں"

غرض کبوتروں کا ذکر چھڑ جائے تو وہ اس قسم کی بے شمار باتیں کرتا تھا۔ ذکر نہ چھڑے تو وہ کسی نہ کسی طریقے سے یہ ذکر چھیڑ دیتا تھا۔ اس کی طبیعت رواں ہو جاتی تھی اور وہ بولتا ہی چلا جاتا تھا۔

اور سننے والے اس کی ان باتوں کو بڑے مزے لے لے کر سنتے تھے۔

اور شاعری سے دلچسپی تو اس کی گھٹی میں پڑی تھی۔ وہ چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے شعر پڑھتا اور شعر کہتا تھا۔ شعراء کے دیوان اس کے آس پاس رہتے تھے۔ میر، غالب اور اقبال کا تو وہ حافظ تھا۔ فارسی میں حافظ عرفی اور نظیری کو اس نے محنت سے پڑھا تھا۔ انگریزی اور فرانسیسی شاعروں کے مطالعے میں بھی اس نے خاصی محنت کی تھی۔ اور اچھا خاصا وقت صرف کیا تھا۔ اور میر کا کلیات تو ہر وقت اس کے سرہانے رہتا تھا اور

وہ اس کو بار بار پڑھتا تھا۔ وہ اس کا حافظ تھا۔

شعر و شاعری سے اس دلچسپی کے اثرات اس کی زندگی اور شاعری دونوں میں اپنی جھلک دکھاتے ہیں۔

ناصر کاظمی میں ایک انقلابی کی روح ضرور تھی۔ لیکن وہ روحانیت کا قائل تھا۔ خدا اور رسولؐ پر ایمان رکھتا تھا۔ اسلام کو ایک مکمل نظام حیات سمجھتا تھا۔ اسلام کے انسانی پہلوؤں سے اسے گہری دلچسپی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اسلامی تصوّف اور مسلمان صوفیائے کرام کی عظمت اور برتری کا قائل تھا۔ اکثر نجی صحبتوں میں صوفیائے کرام کی کرامات کے واقعات بیان کرنا بھی اس کا محبوب مشغلہ تھا۔

ایک دن مجھ سے کہنے لگا: "یہ جو لارنس گارڈن باغ جناح میں ایک مزار ہے، یہ ایک بہت بڑے بزرگ کا مزار ہے۔ ان کو پیر ترٹ مراد شاہ کہتے ہیں اور واقعی یہ پیر ترٹ مراد شاہ ہیں۔ آپ مراد مانگیے ان کی طرف رجوع کیجیے۔ فوراً مراد پوری ہو گی۔"

میں نے پوچھا "کیا تمہیں خود کوئی تجربہ ہوا ہے؟

کہنے لگا "ایک واقعہ سُن لیجیے۔ آپ کو یقین تو نہیں آئے گا۔ لیکن یہ بات سُنی سنائی نہیں ہے۔ خود میرا اپنا تجربہ ہے۔"

میں شوق اور اشتیاق سے سُننے لگا۔

ناصر نے واقعہ اس طرح بیان کیا۔

"میں جن دنوں "ہمایوں" میں اسسٹنٹ اڈیٹر کی حیثیت سے کام کر رہا تھا، تو روزانہ میں لارنس گارڈن میں سے ہو کر میاں بشیر احمد صاحب کی کوٹھی المنظر جایا کرتا تھا۔ ہمایوں کا دفتر ان کی کوٹھی ہی کے ایک کمرے میں تھا۔ لارنس کی سیر بھی ہو جاتی تھی، اور میں اچھے خوشگوار راستے سے سکون کے ساتھ دفتر بھی پہنچ جاتا تھا۔ ایک دن میں اُدھر سے گزرا تو خاصا پریشان تھا۔ جیب میں پیسے نہیں تھے۔ کہیں سے پیسے آنے کی توقع بھی نہیں تھی۔ تنخواہ ملنے میں ابھی کم از کم دس روز باقی تھے۔ میں یہی سوچتا ہوا دفتر کی طرف

جا رہا تھا۔ جب مزار کے قریب سے گذرا تو مجھے یکایک یہ خیال آیا کہ کیوں نہ اس سلسلے میں پیر تُرت مراد شاہ کی طرف رجوع کیا جائے۔ چنانچہ میں نے زبان سے تو کچھ نہ کہا۔ البتہ دل میں اس خیال کو ضرور پیدا کیا کہ کہیں سے کچھ یافت ہونی چاہیے۔ مزار کے قریب رُک کر میں نے احترام کے ساتھ یہ بات پیر صاحب کے حضور میں پیش کی، لیکن ساتھ ہی میرے دل میں یہ خیال بھی پیدا ہوا کہ اگر آج کہیں سے پیسے نہیں ملے تو کل سے میں ادھر سے نہیں گذروں گا اور سمجھ لوں گا کہ پیر ترت مراد شاہ نے میرے لیے کچھ نہیں کیا۔

دل ہی دل میں یہ سب کچھ سوچتا ہوا میں المنظر پہنچا دفتر میں بیٹھا، کاغذات دیکھتا رہا۔ ابھی چند منٹ ہی گزرے تھے کہ میاں صاحب (میاں بشیر احمد) اندر سے آئے حال احوال پوچھا اور کہا کہ "دو تین روز سے پوسٹ مین آپ کا ایک منی آرڈر لے کر آتا ہے۔ آپ اس وقت دفتر میں ہوتے نہیں ہیں۔ رقم زیادہ تھی۔ اس لیے دفتر والے پوسٹ مین سے یہی کہہ کر منی آرڈر واپس کرتے رہے کہ ناصر صاحب اس کو خود ہی وصول کریں گے۔ آج وہ مجھ سے ملا تو میں نے اس سے منی آرڈر کی یہ رقم وصول کر لی۔ میرے کمرے میں آکر لے لیجئے گا۔"

میں نے میاں صاحب کا شکریہ ادا کیا۔ انہیں جو زحمت اٹھانی پڑی اس کے لیے معذرت کی اور منی آرڈر کی رقم ان سے لے لی۔ اس کے بعد دفتر میں مجھ سے نہ بیٹھا گیا۔ جی چاہا کہ مزار پہ جا کر فوراً حاضری دوں اور پیر تُرت مراد شاہ سے کہوں کہ آپ واقعی پیر تُرت مراد شاہؒ ہیں۔ میری مُراد آپ نے تُرت ہی پوری کر دی۔"

ناصر نے یہ واقعہ نہایت عقیدت کے ساتھ مزے لے لے کر بیان کیا، اور مجھے اس کو سن کر بہت ہی لطف آیا۔ کیونکہ میں بھی اکثر پیر ترت مراد شاہ کے مزار پر حاضری دیتا تھا اور اُن کی عظمت کا قائل تھا اور مجھے بھی ایسے کئی تجربات ہو چکے تھے۔

اس لیے ناصر کے اس بیان سے مجھے کچھ اور بھی خوشی ہوئی۔

ناصر کا یہ تجربہ ایسا تجربہ ہے جو تصوّف سے اس کے لگاؤ کو ظاہر کرتا ہے۔ وہ

صوفیائے کرام اور بزرگانِ دین کی برکتوں کا قائل تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ اِن بزرگوں کی برکت سے بڑے بڑے کام ہو سکتے ہیں۔ تصوف سے اس دلچسپی اور صوفیائے کرام اور بزرگانِ دین سے وابستگی نے اُسے روحانیت سے بہت قریب کر دیا تھا، اور اس میں غیر معمولی قوت ارادی اور جذب وکشش کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔

اس کیفیت کو کوئی نام تو نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن ناصر کاظمی اس سے پہچانا جاتا تھا۔ لوگ شاید اسی وجہ سے اس کے گرویدہ ہو جاتے تھے۔ اس کے کام بھی کر دیتے تھے۔ اس کی شاعری کو پسند بھی کرتے تھے اِس پر سر بھی دھنتے تھے۔ اس نے لوگوں کے دلوں میں جگہ بنالی تھی، اور وہ نہ صرف اپنے وطن میں جانا پہچانا جاتا تھا بلکہ اس کی شہرت دُور دُور تک پھیل گئی تھی۔

ناصر جوانی ہی میں اللہ کو پیارا ہو گیا۔ ابھی اس کے مرنے کے دِن نہیں تھے۔ لیکن وہ ایک اچھا آدمی تھا۔ شاید اسی لیے وہ اتنی جلدی مر گیا۔ بڑا آدمی تو ابھی تک زندہ ہے لیکن اچھا آدمی ناصر کاظمی اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ میر صاحب کا یہ شعر پڑھتا ہوا وہ وقت سے بہت پہلے چلا گیا۔

تھا جن کو جن کو عشق کا آزار مر گئے
اکثر ہمارے ساتھ کے بیمار مر گئے

محمد حسن عسکری

عسکری صاحب سے میری ملاقات ۱۹۴۴ء میں ہوئی، جب وہ الہ آباد یونیورسٹی سے انگریزی ادبیات میں ایم اے کرنے کے بعد دہلی آئے، اور یہاں تلاش معاش میں وقت گزارنے لگے۔ اس زمانے میں مسلمانوں کو ملازمت، خاص طور پر کالجوں اور یونیورسٹیوں کی ملازمت بڑی مشکل سے ملتی تھی۔ عسکری صاحب بھی اُس زمانے میں انہی تجربات سے دوچار ہو رہے تھے جو ہر مسلمان نوجوان کو ہوتے تھے۔ اس عالم میں انہوں نے وقتی طور پر شاہد احمد دہلوی صاحب کے ،ساقی، کے ساتھ ایک رابطہ قائم کر لیا تھا۔ شاہد احمد صاحب خود ایک بڑے ہی محنتی اور تجربے کار ایڈیٹر تھے، لیکن عسکری صاحب کا دلی آنا ان کے لیے اور خود ساقی کے لیے بہت مفید ثابت ہوا۔ اس زمانے میں انہوں نے شاہد صاحب کا ہاتھ بٹایا، ساقی میں خود بھی مضامین اور افسانے لکھے اور اپنے دوستوں کو بھی ساقی میں مضامین لکھنے پر آمادہ کیا۔

شاہد صاحب اس زمانے میں رہتے تو کھاری باؤلی میں تھے لیکن ان کا ایک مکان جامع مسجد کے سامنے والی آبادی مٹیا محل کی ایک گلی میں بھی تھا۔ اس گلی کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ میں پہلی بار اس مکان میں شاہد صاحب سے ملا تھا۔ شام کا وقت تھا۔ مغرب کی اذان ہو چکی تھی۔ شاہد صاحب نماز سے فارغ ہو کر میرے ساتھ بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ ایک صاحب نے باہر دروازے پر آواز دی "شاہد صاحب!" اور اندر آ گئے۔

یہ عسکری صاحب تھے۔

شاہد صاحب نے میرا ان سے تعارف کروایا۔ میرے بارے میں کہا کہ "یہ عبادت صاحب ہیں۔ لکھنؤ سے آئے ہیں اور اب دِلّی ہی میں رہیں گے۔ اینگلو عربک کالج میں اُردو پڑھائیں گے۔"

عسکری صاحب بولے "عبادت صاحب! آپ سے مِل کر بہت خوشی ہوئی۔ اب انشاء اللہ ملاقاتیں ہوتی رہیں گی۔ اس وقت تو میں ذرا جلدی میں ہوں۔ ایک صاحب میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ مجھے وہاں جلدی پہنچنا ہے۔ شاہد صاحب سے ایک ضروری بات کرنی تھی۔ اس لیے صرف کھڑے کھڑے بات کرنے کے لیے آیا تھا۔ اس لیے اس وقت اجازت لوں گا۔"

میں نے پوچھا "اب ملاقات کیسے ہوگی؟"۔

کہنے لگے "کل عتیق صدیقی صاحب کے یہاں آیئے۔ آپ اُن سے واقف ہوں گے۔ لکھنؤ سے آئے ہیں دِلّی کے رہنے والے ہیں۔ جامع مسجد کے سامنے ہی ان کا مکان ہے۔ کل مغرب کے بعد وہیں ملاقات ہوگی۔ میں مغرب کے بعد جامع مسجد کے سامنے آپ کا انتظار کروں گا۔"

میں نے اُن سے مِلنے کا وعدہ کر لیا۔ عتیق صاحب کو میں جانتا تھا۔ لکھنؤ میں اُن سے مُلاقات ہوتی تھی۔ وہ یونیورسٹی لائبریری اور پبلک لائبریری میں اکثر آیا کرتے تھے کچھ تحقیق کر رہے تھے۔ یہ نہیں معلوم ہوا کہ اب دلّی میں کیا کرتے ہیں۔

عسکری صاحب اس طرح چند منٹ باتیں کر کے چلے گئے۔

وہ واقعی جلدی میں معلوم ہوتے تھے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ ان پر کچھ اضطراب کی سی کیفیت طاری تھی۔ شیروانی کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ عینک لگی ہوئی تھی، چہرہ لمبا تھا۔ بالوں کی وضع نے اس کو کچھ اور بھی لمبا بنا دیا تھا۔ گندمی رنگ، چھریرا بدن، آگے کے دانت قدرے باہر کی طرف نکلے ہوئے۔ ہر بات میں عاجزی اور انکساری کا رنگ چھایا ہوا تھا لیکن

مجموعی طور پر وحشت سی ٹپک رہی تھی۔ جلدی جلدی باتیں کرتے تھے۔ آنکھ سے آنکھ نہیں ملاتے تھے۔ بے چینی ان کے ایک ایک انداز سے ٹپکتی تھی۔

میں نے انہیں غور سے دیکھا، اور دیر تک دیکھتا اور لطف اندوز ہوتا رہا۔ غائبانہ طور پر ان سے واقفیت تھی۔ کیونکہ میں نے ان کے افسانے پھسلن، چائے کی پیالی اور حرامجادی پڑھ رکھے تھے، اور ان کی شخصیت میں میں نے ایک بہت بڑے افسانہ نگار کی جھلک دیکھی تھی۔ میں ان سے بہت متاثر تھا۔ اس لیے دلی میں جب اس طرح ان سے اچانک ملاقات ہوئی تو ان سے مل کر مجھے بے حد مسرّت ہوئی۔

عسکری صاحب چلے گئے تو شاہد صاحب ان کے بارے میں دیر تک دلچسپ باتیں کرتے رہے کہنے لگے "عسکری صاحب خوب آدمی ہیں۔ پارہ ہیں پارہ۔ انہیں ایک جگہ پر قرار نہیں۔ بہت کم لوگوں سے ملتے ہیں لیکن جن سے ملتے ہیں خوب گھُل مل کر ملتے ہیں۔ ساقی کو انہوں نے سہارا دیا ہے۔ میرا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ بڑے مخلص آدمی ہیں۔ ادب ان کا اوڑھنا بچھونا ہے نثر بھی خوب لکھتے ہیں"

میں شاہد صاحب کی یہ باتیں سُنتا رہا اور ان کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا۔

دوسرے دن مغرب کے وقت میں عتیق صدیقی صاحب کے مکان پر پہنچا۔ تلاش کرنے میں کچھ دیر ہوئی۔ بہر حال پوچھتا پوچھتا پہنچ گیا۔ عتیق صاحب کا مکان کیا تھا۔ بس ایک کمرہ تھا۔ میں نے آواز دی، عتیق صاحب باہر آگئے اور مجھے اندر لے گئے، عسکری صاحب یہاں پہلے سے بیٹھے تھے۔ معلوم یہ ہوا کہ وہ شام کو روزانہ وہاں آتے ہیں اور عتیق صاحب ہی سے آج کل ان کی دوستی ہے۔

عتیق صاحب سے دیر تک کچھ لکھنو کی باتیں ہوتی رہیں۔ ادب اور ادبی رجحانات کا بھی ذکر رہا۔ عسکری صاحب خاموش رہے۔ ہماری باتیں سُنتے رہے۔ اور ہاں میں ہاں ملاتے رہے۔

کوئی نو بجے کے بعد ہم لوگ وہاں سے رخصت ہوئے۔ عتیق صاحب نے ہمیں

خدا حافظ کہا۔ عسکری صاحب میرے ساتھ جامع مسجد تک آئے اور چاوڑی بازار کے موڑ تک میرا ساتھ دیا۔ کچھ دیر وہاں رُک کر باتیں کیں اور پھر ساقی کے لیے مضمون اور نظموں کا تقاضا کر کے رخصت ہوئے۔

وہ ان دنوں ترکمان دروازے کے باہر رہتے تھے۔ کل پھر ملنے کا وعدہ کر کے وہ ترکمان دروازے کی طرف چل دیے۔ میں اینگلو عربک کالج جانے کے لیے اجمیری گیٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔

دوسرے دن وہ اینگلو عربک کالج آئے اور اس طرح کالج میں ملاقاتوں کا سلسلہ باقاعدگی سے شروع ہو گیا۔ عسکری صاحب کو کالج کا ماحول بہت پسند آیا۔ اس وجہ سے کہ اس میں بڑی تہذیب اور شائستگی تھی۔ بڑا سکون تھا۔ بڑی آزادی تھی۔ ہر شخص ایک دوسرے کی عزّت کرتا اور خیال رکھتا تھا۔

اتفاق ایسا ہوا کہ چند ہفتے کے بعد انگریزی کے ایک اُستاد چھ مہینے کی طویل رخصت پر ملک سے باہر چلے گئے۔ یہ جگہ خالی ہوئی تو میں نے عسکری صاحب سے کہا کہ آپ اس کو قبول کر لیجئے۔ پہلے تو انہوں نے انکار کیا لیکن پھر میرے اصرار پر کالج میں انگریزی پڑھانے کے لیے تیار ہو گئے۔ چند روز پڑھانے میں ان کا ایسا دل لگا کہ مستقل طور پر عربک کالج میں رہنے کی خواہش ظاہر کی۔ لیکن وہ جگہ عارضی تھی اس لیے میں کوشش تو کرتا رہا لیکن مجھے یقین نہیں تھا کہ ان کو مستقل کرانے کے معاملے میں مجھے کامیابی ہو سکے گی۔

عسکری صاحب سے میں نے کبھی کبھی دبی زبان سے اس کا اظہار بھی کیا تا کہ کہیں اور بھی ملازمت کی کوشش جاری رہے۔ لیکن عسکری صاحب بڑے ہی بے نیاز آدمی تھے۔ انہوں نے اب سوچ رکھا تھا کہ ملازمت کریں گے تو اینگلو عربک کالج میں۔

چنانچہ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب عسکری ایک روز آئے اور مجھ سے کہا کہ الہ آباد یونیورسٹی میں انہیں انگریزی کی لکچراری مل رہی ہے لیکن وہ وہاں جانے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

میں نے تفصیل دریافت کی تو بتایا کہ" دیب صاحب کا خط الہ آباد سے آیا تھا. آپ کو معلوم ہے وہ میرے محترم استاد ہیں اور مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ انہوں نے مجھے یہ لکھا ہے کہ الہ آباد یونیورسٹی میں انگریزی کے ایک لکچرار کی جگہ خالی ہے، اس پر میرا تقرر ہو سکتا ہے۔ اس لیے انہوں نے مجھے فوراً الہ آباد پہنچنے کی تاکید کی. لیکن میں نے آپ سے مشورہ کئے بغیر یہ لکھ دیا ہے کہ مجھے اینگلو عربک کالج اور دہلی سے کوئی شکایت نہیں۔ اس لیے میں الہ آباد یونیورسٹی میں ملازمت کرنے سے قاصر ہوں۔ ویسے آپ کا بے حد شکر گزار ہوں کہ آپ نے نوازش فرمائی اور میرا خیال رکھا"۔

میں ان کی یہ باتیں سُن کر حیرت زدہ رہ گیا، اور میں نے کہا" الہ آباد یونیورسٹی تو عظیم یونیورسٹی ہے۔ پھر یہ آپ کی اپنی یونیورسٹی ہے۔ دیب صاحب آپ کے شفیق استاد بھی ہیں۔ آپ نے اپنی کتاب بھی ان کے نام معنون کی ہے۔ عربک کالج کی یہ جگہ جس پر آپ کام کر رہے ہیں عارضی ہے۔ آپ کو دیب صاحب کی بات مان لینی چاہیئے تھی"۔

عسکری صاحب کہنے لگے" مجھے معلوم تھا کہ آپ یہی سب کچھ کہیں گے۔ اسی لیے تو میں نے آپ سے مشورہ کئے بغیر دیب صاحب کے خط کا جواب لکھ دیا۔ اور ابھی ابھی اسے پوسٹ کر کے آپ کے پاس آیا ہوں تاکہ آپ کے کہنے سے مجھے اپنا فیصلہ بدلنے کا خیال تک پیدا نہ ہو۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا"۔

اب میں عسکری صاحب سے بحث کیا کرتا۔ مجھے ان کے مزاج کا علم تھا۔ اس لیے میں نے یہی کہا کہ" آپ نے اچھا کیا" اس خیال سے کہ انہیں ملال نہ ہو۔

خیر تو عسکری صاحب الہ آباد نہیں گئے۔

اور میرے لیے یہ بات پریشانی کا باعث ہوئی، کیونکہ اس زمانے میں مسلمانوں کو ملازمت کا ملنا اور خصوصیت کے ساتھ یونیورسٹیوں میں اور پھر انگریزی میں، تقریباً ناممکن سی بات تھی۔ میں یہ سوچتا رہا کہ عسکری صاحب نے ایک بہت اچھا موقع کھو دیا، اور دیب صاحب کی شفقت اور محبت سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔

لیکن کوئی کیا کر سکتا تھا۔ عسکری صاحب مزاج کے اعتبار سے بادشاہ تھے۔ جو بات دل میں سما جائے وہی کرتے تھے۔ کوئی انہیں دوسری طرف نہیں لے جا سکتا تھا۔

قصہ مختصر یہ کہ وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ چھ مہینے کے بعد عربک کالج کی ملازمت ختم ہوگئی۔ کوشش کے باوجود اس میں توسیع کرانے میں مجھے کامیابی نہیں ہوئی۔ پرنسپل نے اپنی سی پوری کوشش کی۔ لیکن وہ بھی ایک نئی پوسٹ کا اضافہ نہ کروا سکے۔ گورننگ باڈی نے ان سے اتفاق نہیں کیا۔ اور عسکری صاحب کی ملازمت ختم ہوگئی۔

اسی زمانے میں مجھے یہ علم ہوا کہ شبلی کالج اعظم گڑھ میں انگریزی کے پروفیسر کی ایک جگہ خالی ہے، اور وہ لوگ کسی مسلمان کو اس جگہ پر رکھنا چاہتے ہیں۔

میں نے عسکری صاحب سے اس کا ذکر کیا۔ اور کسی طرح انہیں اعظم گڑھ جانے پر آمادہ کر لیا۔ چنانچہ وہ میرے اصرار پر دلّی سے اعظم گڑھ کے لیے روانہ ہوئے۔ میں نے خود انہیں رخصت کیا۔ جاننے والوں کو خطوط بھی لکھ دیے۔

لیکن تیسرے روز دیکھا کہ عسکری صاحب اینگلو عربک کالج میں چلے آرہے ہیں۔ میں انہیں دیکھ کر حیران ہوا۔ میں نے خیریت پوچھی اور دریافت کیا کہ آپ اتنی جلدی کیسے واپس آگئے۔

عسکری صاحب کہنے لگے "صاحب! آپ نے مجھے کہاں بھیج دیا تھا۔ میں اعظم گڑھ تک تو پہنچ گیا۔ لیکن شبلی کالج تک نہ پہنچ سکا۔ درمیان سے واپس آگیا۔"

میں نے کہا "وہ کیسے؟"

کہنے لگے "میں اعظم گڑھ کے اسٹیشن پر اترا۔ ویران سا اسٹیشن تھا۔ باہر نکل کر میں نے ایک تانگے والے سے کہا کہ "میاں شبلی کالج پہنچا دو۔" وہ تیار ہو گیا۔ میں اس کے تانگے میں سامان رکھ کر بیٹھ گیا۔ اجاڑ سی سڑک پر تانگہ چلنے لگا۔ کچھ دور اور آگے گیا تو سڑک کچھ اور بھی ویران نظر آنے لگی۔ اس سڑک پر تو بجلی کے کھمبے تک نہیں تھے۔ میونسپلٹی کی لالٹینیں لگی تھیں، گاؤں کا سا ماحول معلوم ہوتا تھا۔ لوگ عجیب سے پوربی لہجے میں اردو بول رہے

تھے۔ اس ماحول کو دیکھ کر میری طبیعت گھبرا گئی اور اختلاج سا ہونے لگا۔ چنانچہ میں نے یہ فیصلہ کیا کہ میں اس ویران جگہ میں نہیں رہ سکوں گا۔ اس لیے میں نے تانگے والے سے کہا، "میاں! اسٹیشن واپس چلو، میں شبلی کالج نہیں جاؤں گا۔ میں اس شہر میں رہنے کے لیے تیار نہیں۔"

تانگے والا میری باتیں سُن کر حیران اور پریشان ہوا، لیکن اُس نے میری ہدایت کے مطابق مجھے اسٹیشن پہنچا دیا۔ اور میں گاڑی میں بیٹھ کر دوسرے ہی دن دلی واپس پہنچ گیا، شکر ہے کہ اعظم گڑھ اور شبلی کالج سے مجھے نجات مِلی۔ دِلّی پہنچا تو جان میں جان آئی۔ عبادت صاحب! میں دلّی چھوڑ کر کہیں اور نہیں جا سکتا۔"

مجھے عسکری صاحب کی ان باتوں نے بہت لطف دیا اور میں یہ سوچتا رہا کہ اس معصوم آدمی کا دلّی چھوڑ کر اعظم گڑھ یا کسی اور جگہ ملازمت کے لیے جانا ہرگز مناسب نہیں۔

میں نے یہ روداد اینگلو عربک کالج کے پرنسپل کو سُنائی۔ وہ بہت محظوظ ہوئے ، اور کہنے لگے "عسکری صاحب کے لیے کسی نہ کسی طرح عربک کالج ہی میں ملازمت کا انتظام کرنا پڑے گا۔ ایسے معصوم اور دلچسپ آدمی کو دلّی سے باہر نہیں جانا چاہیئے۔"

چنانچہ چند روز میں عسکری صاحب کے لیے انگریزی کی ایک جگہ کسی طرح بنائی گئی، اور اس پر ان کا تقرر ہو گیا۔

اور عسکری صاحب لڑکوں کو ایک دفعہ پھر انگریزی پڑھانے لگے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب پاکستان کی تحریک شروع ہو چکی تھی۔ اینگلو عربک کالج اس تحریک کا گڑھ تھا۔ قائدِ اعظم اس کالج کے سرپرست اور نوابزادہ لیاقت علی خاں صاحب اس کے صدر تھے۔ مسلم لیگ کے جلسے اسی کالج میں ہوتے تھے۔ ہر وقت ایک جشن کا سا سماں رہتا تھا۔ اساتذہ اور طلباء سب مسلم لیگ کے حامی تھے۔ اور تحریک پاکستان میں پیش پیش تھے۔

عسکری صاحب اس ماحول سے متاثر ہوئے اور وہ تحریک پاکستان میں پیش

پیش نظر آنے لگے۔ بظاہر تو ان کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں تھا، زیادہ وقت وہ ادبی مطالعے میں گذارتے تھے، لیکن ذہنی طور پر وہ پاکستان کی تحریک سے پوری طرح وابستہ ہوگئے اور اس وابستگی نے ان کے ہاں بڑی شدت اختیار کر لی۔ اب ہر وقت وہ پاکستان کی باتیں کرتے تھے، اور مسلمانوں کے لیے اس کی تشکیل و تعمیر کو ضروری خیال کرتے تھے۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ مسلمان ہندوؤں کے ساتھ مل کر نہیں رہ سکتے۔ آگ اور پانی کا میل بھلا کس طرح ممکن ہو سکتا ہے۔ غرض عسکری صاحب خاصے جذباتی انداز میں اس قسم کی باتیں کرتے تھے۔

اس زمانے میں مذہب کا ان پر برائے نام بھی اثر نہیں تھا۔ وہ صرف ایک ادبی آدمی تھے۔ انہوں نے جدید ادب کے بڑے بڑے علم برداروں کا بغور مطالعہ کیا تھا، اور ان دنوں وہ اپنا زیادہ وقت مغرب کو سمجھنے اور تہذیب مغرب سے آشنا ہونے میں صرف کر رہے تھے۔ ساتھ ہی مشرقی ادبیات خصوصاً اردو شاعروں کے مطالعہ کا سلسلہ بھی جاری تھا عسکری صاحب ان موضوعات پر خوب پڑھتے اور مضامین و مقالات لکھتے تھے۔ اس زمانے میں انہوں نے ساقی، میں تنقیدی جھلکیاں، کے عنوان سے ایک ادبی کالم لکھنا شروع کیا تھا اس میں جیمس جوائس، بادیلیر، پروست، ییٹس، ایلیٹ اور ازرا پاؤنڈ وغیرہ پر ان کے ایسے معیاری مقالات شائع ہوئے کہ انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں بھی کم کم شائع ہوئے ہوں گے۔ اس کے علاوہ اس زمانے میں میر، جرأت، حالی، اسیر اور محسن کاکوروی وغیرہ پر بھی انہوں نے مضامین لکھے۔ ادبی اور شعری مسائل پر بھی بے شمار تنقیدی مضامین شائع کئے اور ساتھ ہی افسانوں کی تخلیق کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "جزیرے" اسی زمانے میں شائع ہوا تھا۔

عسکری صاحب اس زمانے میں ترکمان دروازے کے اندر ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتے تھے۔ بہت کم لوگوں کو علم تھا کہ عسکری صاحب یہاں رہتے ہیں۔ ان کے دوستوں کی تعداد اس زمانے میں تین چار سے زیادہ نہیں تھی۔ ان میں

ایک تو عتیق صدیقی صاحب تھے دوسرے مشہور افسانہ نگار غلام عباس، تیسرے ایک صاحب تھے عطا محمد شعلہ اور چوتھے میں۔ شاہد احمد دہلوی صاحب سے ان کی ملاقات تو تھی لیکن اس کو دوستی نہیں کہا جاسکتا۔ ان سے تو صرف کچھ ادارتی نوعیت کے تعلقات تھے۔ عسکری صاحب خود ان دوستوں کے پاس جاتے تھے، ان کے پاس بیٹھتے تھے، باتیں کرتے تھے، لطیفے سناتے تھے، لیکن ان کی باتیں زیادہ سنتے تھے، خود کم بولتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ سوائے میرے انہوں نے اپنا مکان کسی کو نہیں دکھایا۔

ایک دن شام کو میرے پاس آئے اور کہنے لگے "عبادت صاحب! آج آپ میرے ساتھ چلیئے۔ میں آپ کو اپنے گھر لے چلوں گا۔ ذرا گپ ہوگی۔"

میں بڑی خوشی سے تیار ہوگیا۔ اجمیری دروازے سے نکل کر ہم لوگ رام لیلا گراونڈ سے ہوتے ہوئے ترکمان دروازے کے اندر پہنچے اور ایک گلی میں مڑے۔ اس میں ایک مکان تھا، جس کی دوسری منزل پر عسکری صاحب رہتے تھے۔ یہ مکان کیا تھا، ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں ایک چارپائی کی جگہ تھی۔ اس کے آس پاس عسکری صاحب نے ایک دو کرسیاں اور ایک چھوٹی سی میز ڈال لی تھی۔ کمرے میں سامنے کی طرف ایک مچان سا تھا۔ اس پر عسکری صاحب نے کتابیں جمع کر رکھی تھیں۔ وہ مچان خاصا اونچا تھا۔ آسانی سے کتابیں نہیں اتاری جاسکتی تھیں۔ لیکن اس کے قریب ہی دیوار سے لگا ہوا ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی کا جھلنگا رکھا ہوا تھا۔ اس جھلنگے کی موجودگی اس کمرے میں مجھے عجیب سی معلوم ہوئی۔ چنانچہ میں نے عسکری صاحب سے پوچھا کہ "اس کا کیا مقصد ہے؟"

وہ کہنے لگے "اس کے سہارے مچان پر چڑھ جاتے ہیں اور جب ضرورت ہوتی ہے کتابیں نیچے اتار لیتے ہیں۔"

اس پر مجھے بے اختیار ہنسی آگئی، میں نے کچھ نہ کہا، اور دیر تک عسکری صاحب کے اس معصومانہ اور قلندرانہ انداز سے لطف اندوز ہوتا رہا۔

اس مکان میں دو کھڑکیاں تھیں جو سامنے کی طرف ایک چھوٹے سے صحن میں کھلتی

تھیں۔ گرمیوں میں ان کھڑکیوں کا کھلا رہنا ضروری تھا۔ کیونکہ پنکھے وغیرہ کی علت عسکری صاحب نے نہیں پالی تھی۔

میں نے پوچھا "آپ کو گرمی تو ضرور لگتی ہوگی، ایک پنکھا رکھ لیجیے۔"

کہنے لگے "پنکھے سے طبیعت پر خراب اثر ہوتا ہے۔ دھیان بھی بٹتا ہے۔ اس لیے میں پنکھے کا قائل نہیں۔ کھڑکیاں کھلی رکھتا ہوں۔ لیکن ایک دقت یہ ہے کہ صاحب! سامنے کچھ لڑکیاں رہتی ہیں، وہ ہڈیاں وغیرہ اس طرح پھینکتی ہیں کہ کمرے میں آکر گرتی ہیں مجھے بہت ستاتی ہیں۔ شاید کسی کالج یا اسکول کی لڑکیاں ہیں انہیں معلوم ہے کہ میں یہاں رہتا ہوں۔ بس مجھے پریشان کرتی رہتی ہیں۔ لیکن میں کیا کر سکتا ہوں۔ کھڑکیوں کو بند بھی نہیں کر سکتا۔ ان کے والدین سے شکایت بھی نہیں کر سکتا۔ عجب اُلجھن ہے۔"

مجھے شرارت سوجھی۔ چنانچہ میں نے کہا "عسکری صاحب! مصحفی کا یہ شعر پڑھا کیجیے۔"

اے مصحفی تو ان سے محبت نہ کیجیو
ہوتی بڑی غضب کی ہیں یہ دلّی والیاں

ذرا زور سے ترنّم کے ساتھ یہ شعر پڑھیں گے تو یہ سلسلہ بند ہو جائے گا۔ تجربہ کر کے دیکھیے۔"

عسکری صاحب یہ سُن کر مُسکرائے۔ لیکن کچھ بولے نہیں۔

اور مجھے ان کے اس انداز پر بہت ہی پیار آیا۔

اس چھوٹے سے کمرے میں عسکری صاحب دن بھر پڑھتے لکھتے تھے۔ صرف ایک دو گھنٹے کے لیے کالج جاتے تھے۔ پھر واپس آجاتے تھے اور پھر شام تک کام کرتے رہتے تھے۔ پڑھنے لکھنے کے علاوہ ان کا محبوب مشغلہ اس زمانے میں لطیفے بنانا تھا۔ ہر روز وہ چند لطیفے بناتے تھے، اور پھر ان کو لے کر باہر نکلتے تھے۔ سب سے پہلے رات کو اینگلو عربک کالج ہوسٹل میں آکر یہ لطیفے مجھے سناتے تھے، اور پھر غلام عباس کے ہاں منٹو روڈ پر چلے جاتے تھے۔ وہاں سے کوئی بارہ بجے کے قریب ان کی واپسی ہوتی تھی اور وہ اپنے چھوٹے سے کمرے میں واپس آکر کچھ دیر پڑھنے لکھنے کے بعد سو جاتے تھے۔

یہ لطیفے عسکری صاحب کی ذہانت کے آئینہ دار ہوتے تھے اور ان لطیفوں کو سنا کر انہیں ایک تسکین سی ہو جاتی تھی۔ ان میں سے بعض لطیفے مجھے ابھی تک یاد ہیں لیکن افسوس ہے کہ میں انہیں یہاں لکھ نہیں سکتا۔

عسکری صاحب کے تخلیقی مزاج کا ایک یہ پہلو بھی تھا۔ ان کی ذہانت اس زمانے میں اس طرح کی نہ جانے کتنی ہی صورتوں میں اپنے آپ کو نمایاں کرتی تھی۔

اس طرح دن گزرتے رہے اور ۱۹۴۷ء آ گیا۔ اگست کے مہینے میں پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔ اس سے قبل ہی وسیع پیمانے پر فسادات شروع ہو گئے۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کیا جائے۔ پہلے امرتسر میں ہنگامہ ہوا۔ پھر یو پی کے مغربی اضلاع میں فسادات کی آگ پھیل گئی اور بالآخر دلّی بھی اس کی لپیٹ میں آ گیا۔

کالج بند ہو گئے اور علمی و تعلیمی زندگی مفلوج ہو کر رہ گئی۔

عسکری صاحب اگست کے آخر میں میرٹھ چلے گئے اور ہم لوگ رفیوجی ہونے اور اپنی اپنی جانیں بچانے کی غرض سے پرانے قلعے میں پناہ لینے کے لیے دلّی میں رہ گئے۔

ستمبر کے آخر میں جب اس آگ اور خون کے دریا کو تیر کر میں کسی طرح لکھنؤ پہنچا تو وہاں ریڈیو سے یہ خبر ملی کہ عسکری صاحب کسی فوجی اسپیشل میں بیٹھ کر لاہور پہنچ گئے ہیں۔ اور اب اسی شہر نگاراں میں ان کا قیام ہے۔

لاہور سے انہوں نے میری خیریت معلوم کرنے کے لیے لکھنؤ خط لکھے، اور ان خطوں میں اپنے لاہور پہنچنے کی تفصیل بھی لکھی جس کا لب لباب یہ تھا کہ پاکستان بن گیا ہے۔ مسلمانوں کو ایک نئی مملکت مل گئی ہے۔ یہ تاریخ کا بہت ہی اہم واقعہ ہے۔ ہندوستان کے تمام مسلمانوں کا فرض ہے کہ اس کو مضبوط بنائیں۔ ہندوستان میں اب ان کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ وہ وہاں اچھوت بن کر رہیں گے۔ اس لیے مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں پاکستان آ کر اس کو مضبوط بنانا چاہیے۔ وغیرہ وغیرہ

عسکری صاحب کے ان مشوروں پر بے شمار مسلمانوں نے عمل کیا۔ اور بالآخر میں بھی

پاکستان آ گیا۔ عسکری صاحب میرے آنے سے بہت خوش ہوئے۔

لاہور میں آ کر عسکری صاحب نے پاکستانی ادب کا تصوّر پیش کیا، اسلامی ادب کی تحریک چلائی، اور ناصر کاظمی کو دریافت کیا۔

ان کے خیال میں ناصر کاظمی پہلا پاکستانی شاعر تھا جس نے اپنے اشعار میں قیام پاکستان کے وقت ہونے والی سازشوں کے نتیجے میں جو بُرا وقت مسلمانوں کو دیکھنا پڑا اس کے تمام پہلوؤں کو اپنی شاعری میں مجسم کر دیا۔ ان کے خیال میں پاکستان اور پاکستانی کلچر کی روح اس کی شاعری میں ہر جگہ اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔

اور ناصر کاظمی عسکری صاحب کی ان باتوں سے بہت جلد مشہور ہو گیا۔ اور واقعی ایک پاکستانی شاعر کی حیثیت سے اسے مشہور ہونا ہی چاہیئے تھا۔

یہ سب عسکری صاحب کی تنقیدی بصیرت کی کارفرمائی تھی۔

منٹو صاحب بھی اس زمانے میں بمبئی سے لاہور آ گئے تھے۔ اور عسکری صاحب سے ان کی بڑی دوستی تھی۔ چنانچہ ان دونوں نے مل کر اس زمانے میں "اردو ادب" نکالا جس میں اعلیٰ پائے کے ادبی مضامین اور افسانے شائع ہوئے۔ عسکری صاحب منٹو کی ادبی اہمیت کے قائل تھے، اور انہیں ایک بڑا افسانہ نگار سمجھتے تھے۔ ادب ان کے اس ملاپ اور دوستی کی بنیاد تھا، ورنہ ظاہر ہے کہ منٹو صاحب اور عسکری صاحب کی راہیں زندگی اور ادب دونوں میں جُدا جُدا تھیں۔ عسکری صاحب بنیادی طور پر ایک ادبی آدمی تھے۔ چنانچہ ادب اکثر ان کی دوستی کی بنیاد بن جاتا تھا۔ ادب میں جوہر قابل کو عسکری صاحب کی نگاہیں دیکھ لیتی تھیں اور اس جوہر قابل سے کام لینا انہیں خوب آتا تھا۔

کچھ عرصے بعد عسکری صاحب کو ملازمت کے سلسلے میں کراچی جانا پڑا۔ لیکن لاہور سے انہوں نے اپنا رشتہ توڑا نہیں۔ وہ رہتے تو کراچی میں تھے لیکن ان کا ذہنی رابطہ اسی شہرِ غزالاں کے ساتھ تھا۔ چنانچہ سال میں دو تین بار طویل تعطیلات میں لاہور آ کر قیام کرتے تھے۔

اور اس کی وجہ یہ تھی کہ لاہور ایک ادبی مرکز تھا۔ اور یہاں کے ادبی ماحول سے وہ گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ لاہور میں میرے ساتھ اکثر عسکری صاحب کی ملاقاتیں ہوتی تھیں۔

عسکری صاحب شروع شروع میں لاہور آ کر کرشن نگر میں ارجن روڈ پر ٹھہرتے تھے۔ میں اس مکان میں بارہا ان سے ملنے گیا۔ میرا خیال تھا یہ مکان عسکری اور ان کے بھائیوں نے اپنے نام الاٹ کروالیا ہے لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ کرائے پر تھا۔ چنانچہ جب سمن آباد کی آبادی بن گئی تو عسکری صاحب کے بھائی اسی سڑک پر ایک مکان میں منتقل ہو گئے جہاں میرا قیام تھا۔ میرے مکان اور اس مکان میں کوئی سو دو سو گز کا فاصلہ ہو گا۔ اس لیے عسکری صاحب جب بھی کراچی سے لاہور آتے تو ان کا زیادہ وقت میرے ساتھ ہی گزرتا۔

صبح کی سیر کے بعد وہ سیدھے میرے پاس آتے، ہم لوگ ایک ساتھ ناشتہ کرتے، چائے پیتے اور گھنٹوں باتیں کرتے تھے۔

برسوں یہ سلسلہ جاری رہا۔

اس زمانے میں عسکری صاحب میں غضب کا تحمّل تھا۔ کچھ ہوتا رہے، کوئی کچھ کہتا رہے، وہ بولتے نہیں تھے۔ ”ایک چپ سو کو ہرائے“ ان کا مسلک تھا۔ باتیں تو دوسرے کرتے تھے، عسکری صاحب تو صرف سُنتے تھے۔ کبھی ایک آدھ فقرہ کہہ دیا تو کہہ دیا، ورنہ خاموشی ہی ان کی گفتگو تھی۔

ایک دن تو میں نے اس خاموشی اور تحمل کا کمال دیکھا۔

میاں امین اسلم سے ہم لوگوں کے پرانے تعلقات تھے، اور وہ ہم سے بہت اچھی طرح ملتے اور بڑی خاطر مدارت کرتے تھے، ایک دن ہم لوگوں نے یہ طے کیا کہ ذرا میاں صاحب سے ملنا چاہیئے اور ان کے ساتھ کچھ وقت گذارنا چاہیئے۔

میں نے عسکری صاحب سے اس کا ذکر کیا تو وہ میاں صاحب کے ہاں جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ چنانچہ ایک شام میں، عسکری صاحب اور انتظار حسین میاں اسلم کے ہاں بارود خانے پہنچے۔ میاں صاحب نے بڑی خاطر کی۔ قسم قسم کے کھانوں کا اہتمام کیا۔

بڑی محبت سے کھانا کھلایا۔ کھانے کے بعد باتیں شروع ہوئیں۔

فسادات کے بارے میں میاں صاحب کا ناول "رقصِ ابلیس" شائع ہو چکا تھا اور عسکری صاحب اس پر مقدمہ لکھ چکے تھے۔

میں نے رسماً میاں صاحب کے اس ناول کی تعریف کی اور عسکری صاحب کے مقدمے کو بھی سراہا۔

میاں صاحب کچھ دیر تو خاموشی سے میری باتیں سنتے رہے۔ لیکن پھر نہ جانے کیا ہوا کہ پھٹ پڑے اور عسکری صاحب کے بارے میں شکوہ و شکایت کا ایک دفتر کھول دیا۔

کہنے لگے "صاحب! دیکھیے عسکری صاحب میرے بھائی ہیں۔ انہوں نے رقصِ ابلیس کا دیباچہ تو لکھا، لیکن اس قدر مقبولیت حاصل کرنے والے ناول پر کہیں تبصرہ نہیں کیا حالانکہ یہ مختلف موضوعات پر لکھتے رہتے ہیں۔ انہوں نے ہزارہا صفحے لکھے ہیں یہ لیکن مجھے اور میرے ناول کو درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ کم از کم میرے مسلمان ہونے کا تو خیال کیا ہوتا"

غرض میاں صاحب کئی گھنٹے تک اسی قسم کی باتیں کرتے رہے۔ لیکن عسکری صاحب کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ بس سنتے رہے، سنتے رہے، سنتے رہے۔

میں تو تھک گیا، اس لیے کئی گھنٹے کی اس آزمائش کے بعد میں یکا یک اٹھا۔ میاں صاحب سے اجازت لی، اور ہم لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔

میاں صاحب نے یہ کہہ کر ہمیں رخصت کیا کہ "عسکری صاحب میری باتوں کا ضرور اثر قبول کریں گے۔"

عسکری صاحب اس پر بھی خاموش رہے۔

میں نے ایسا کم گو خاموش اور متحمل مزاج آدمی اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔

عسکری صاحب ساری زندگی مجمعوں سے گھبراتے اور محفلوں سے کتراتے رہے۔ وہ ادیب تھے لیکن ادبی جلسوں میں کبھی نہیں گئے۔ وہ استاد تھے لیکن زیادہ طالب علموں سے کبھی بے تکلف نہیں ہوئے۔ بے شمار لوگ ان کے شیدائی تھے۔ لیکن وہ ان سے ملتے

ہوئے اور ان سے باتیں کرتے ہوئے گھبراتے تھے۔ وہ تو اپنے صرف چند مخصوص دوستوں سے بات کر سکتے تھے۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھے ہوں، اور اگر کہیں سے کوئی اجنبی ٹپک پڑے تو ان کی زبان میں تالے لگ جاتے تھے اور ان پر ایک بے چینی اور پریشانی کا عالم طاری ہو جاتا تھا۔

مجمع سے گھبرانے کا ایک واقعہ مجھے کبھی نہیں بھولتا۔

آج سے کوئی پندرہ بیس سال ادھر کی بات ہے، عسکری صاحب گرمیوں کی تعطیلات میں کراچی سے لاہور آئے ہوئے تھے۔ اسی زمانے میں عید آگئی۔

میں نے ایک دن پہلے عسکری صاحب سے کہا کہ "عید کی نماز ایک ساتھ پڑھنے چلیں گے۔"

عسکری صاحب تیار ہو گئے۔ وعدہ کر لیا کہ نماز کے وقت سے چند منٹ پہلے ہی میرے ہاں پہنچیں گے اور پھر سمن آباد کی گراؤنڈ میں نماز ادا کریں گے۔

چنانچہ عسکری صاحب عید کے دن صبح صبح وقت پہ آئے۔ اور ہم سب مل کر عید کی نماز ادا کرنے کے لیے گراؤنڈ کی طرف چلے۔

لیکن ابھی ہم برگد کے درخت تک پہنچے تھے کہ عسکری صاحب کو نہ جانے کیا ہوا؟ اور ان کے اندر نہ جانے کیسی لہر اٹھی کہ انہوں نے یہ کہہ کر ہمارا ساتھ چھوڑ دیا کہ "عبادت صاحب! میں تو گھر چلا۔ اتنے بڑے مجمع کو میں کیسے برداشت کروں گا؟"

اور یہ کہہ کر وہ واپس لوٹ گئے، نماز رہ گئی۔

اور میں حیران رہ گیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ان پر مذہب کا اثر اتنا گہرا نہیں تھا۔ چنانچہ ان کی یہ بات مجھے ایسی کچھ عجیب نہیں معلوم ہوئی۔ ورنہ آگے چل کر تو ایک زمانہ ان کی زندگی میں ایسا بھی آیا جب وہ ہر نماز باجماعت پڑھتے تھے۔ لیکن لوگوں سے زیادہ ملنا جلنا، ان سے بے تکلف اور باتیں کرنا ان کے لیے ممکن نہیں تھا۔

وہ تو ذوقِ تنہائی کے پرستار تھے۔ اس لیے میں ان کے سامنے دل ہی دل میں میر حسن کا یہ شعر پڑھا کرتا تھا۔ ؎

ذوقِ تنہائی میں خلل ڈالا آ کے مجھ پاس اک گھڑی تو نے

عسکری صاحب کے ملنے والوں کا حلقہ بہت محدود تھا۔ وہ صرف چند لوگوں کی صحبت میں بیٹھ سکتے تھے اور صرف انہیں سے باتیں کر سکتے تھے۔ نئے دوست بنانے کا گُر انہیں ضرور آتا تھا۔ چنانچہ وہ بعض نوجوانوں تک کو اپنی محفلوں میں بلانے کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔ جوہرِ قابل کو تلاش کرنا انہیں خوب آتا تھا، اور وہ ایسے لوگوں کو دوست بنانے کا بڑا سلیقہ رکھتے تھے جن میں انہیں کوئی چنگاری نظر آتی تھی۔ ایسے لوگوں کا انتخاب وہ ادیبوں اور شاگردوں میں سے کر لیتے تھے۔

اور ایسے لوگوں سے ان کی دوستی پختہ ہو جاتی تھی۔

عسکری صاحب ایک عظیم استاد تھے۔ انہوں نے ساری زندگی اس عظیم اور موقر پیشے کے لیے وقف کر دی۔

ان کی شفقت اور محبت طالب علموں کو گرویدہ بنا لیتی تھی۔ وہ طالب علموں کی مدد مختلف طریقوں سے کرتے تھے۔ کوئی بھی طالب علم ان کے پاس کسی وقت بھی جا سکتا تھا۔ اور نہ صرف اپنے کالج کے طالب علم بلکہ دوسرے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طالب علم بھی عسکری صاحب سے استفادہ کرتے تھے۔ ان کے بعض شاگرد تو ایسے تھے کہ وہ داخلہ تو لیتے تھے یونیورسٹی میں لیکن پڑھنے کے لیے آتے تھے عسکری صاحب کے پاس۔ اگر میں یہ کہوں کہ عسکری صاحب نے سینکڑوں طالب علموں کو ایم اے کروا دیا۔ بیسیوں کو پی ایچ ڈی کی ڈگریاں دلوا دیں تو مبالغہ نہیں ہوگا۔

عسکری صاحب کے ایسے استاد آجکل خال خال ہی نظر آتے ہیں۔

علم و ادب عسکری صاحب کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ اُن کا زیادہ وقت لکھنے پڑھنے میں گزرتا تھا۔ اور وہ بڑی محنت سے ایک سچے اور صحیح طالب کی طرح پڑھتے تھے

اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ انگریزی ادب کے بارے میں ان کی معلومات اتنی تھی کہ شاید ہی انگریزی کے کسی پروفیسر کو اتنی معلومات ہو۔ پھر یورپ کی مختلف علمی اور ادبی تحریکوں سے جتنے وہ واقف تھے شاید ہی ہمارے ہاں کسی کو اس کا عشر عشیر بھی معلوم ہو۔

اور ساتھ ہی وہ مشرقی علوم، اور مشرقی ادبیات سے اپنے آپ کو پوری طرح آگاہ رکھتے تھے، فارسی اور اردو کے کلاسیکی اور جدید دونوں ادبیات کا مطالعہ انہوں نے بڑی محنت سے کیا تھا اور وہ ان کے مختلف پہلوؤں پر حاوی تھے۔

عسکری صاحب کے سپرد کوئی علمی کام کر دیا جائے تو وہ اس کو انتہا تک پہنچا دیتے تھے، بس اس میں ڈوب جاتے تھے۔

لندن سے لاہور واپس آکر میں نے زبان اور لسانیات کے موضوع پر ایک کتاب چھاپنے کا منصوبہ بنایا تاکہ اس پس منظر میں اردو زبان کا مطالعہ کیا جا سکے۔ اس سلسلے میں عسکری صاحب سے بھی مشورہ کیا۔ وہ کئی سال تک اس مجموعے کے لیے مضامین لکھوانے کی کوشش کرتے رہے۔ اور خاصی تعداد میں نہ صرف ہندوستان اور پاکستان کے لکھنے والوں بلکہ فرانسیسی انگریز اور جرمن لکھنے والوں سے بھی مضامین لکھوائے ان مضامین کو میں نے اورینٹل کالج میگزین میں شائع کیا اور ان کو علمی دنیا میں بہت پسند کیا گیا۔

شام کو کتابوں کی دوکان میں جانا اور کتابوں کا تلاش کرنا عسکری صاحب کا معمول تھا۔ علم کی پیاس انہیں کشاں کشاں ان دوکانوں میں لے جاتی تھی اور وہ نہ صرف اپنے لیے بلکہ میرے لیے بھی کتابیں خریدتے تھے۔ برسوں تک ان کا یہ معمول رہا کہ وہ ٹامس اینڈ ٹامس سے میرے لیے ادبی کتابیں منتخب کر کے لاہور بھجواتے تھے۔

اور یہ عسکری صاحب کی اس عنایت کا نتیجہ ہے کہ اس وقت اورینٹل کالج میں ادبی اور تنقیدی کتابوں کا بہترین انتخاب موجود ہے۔

ادھر چند سال سے عسکری صاحب ایک اور ہی عالم میں تھے۔ مذہب کا اثر ان پر بہت گہرا ہو گیا تھا۔ اور روز بروز بڑھتا جاتا تھا۔ ادیب کی حیثیت سے بھی ان

کی دلچسپی صرف دینی ادب تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ انہوں نے کلام پاک کا غور سے مطالعہ کیا تھا اور بار بار کیا تھا۔ تصوف سے ان کی دلچسپی بہت بڑھ گئی تھی۔ اور انہوں نے نہ صرف اسلامی تصوف کے علم برداروں کا مطالعہ غور سے کیا تھا بلکہ مغربی صوفیا اور ان کے فکر و فلسفہ کو بھی قریب سے دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ خصوصیت کے ساتھ فرانس میں اس وقت اسلام اور اسلامی تصوف اور فلسفے پر جو کام ہو رہا ہے، اس سے وہ بہت متاثر تھے۔ اپنی فرانسیسی پر انہوں نے اس مقصد سے جلا کی تھی۔ اور وہ فرانسیسی جو انہوں نے بغیر کسی استاد کے پڑھی تھی، وہ اس میں مضامین تک لکھنے لگے تھے۔ ان مضامین کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ یہ معیاری فرانسیسی رسالوں میں شائع ہوتے تھے اور اسلامی دنیا میں ذوق و شوق سے پڑھے جاتے تھے۔ مغرب میں بھی ان کا چرچا تھا۔

یہ سب دین داری کا فیض تھا جو عسکری صاحب کو علمی دنیا میں ایسی بلندی نصیب ہوئی۔ دین اور مذہب سے عسکری صاحب کی یہ دلچسپی بڑے خلوص پر مبنی تھی۔ تقریباً پندرہ سولہ سال ان کی زندگی میں ایسے ضرور گزرے ہیں جب انہوں نے اپنا زیادہ وقت عبادت اور ریاضت میں گذارا ہے اور اوراد وظائف میں اپنی زندگی کی راتیں بسر کی ہیں۔ لیکن ان کی بڑائی اس میں ہے کہ وہ اپنے ان معمولات کو کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے۔ لوگوں کو اتنا بھی معلوم نہیں ہوتا تھا کہ وہ نماز پڑھنے جا رہے ہیں۔ چپکے سے اٹھ جاتے تھے۔ کوئی بیٹھا ہو تو کوئی کتاب یا رسالہ ہاتھ میں تھما دیتے تھے، اور یہ کہہ کر چل دیتے تھے کہ "بس ابھی آیا"۔

وہ خدا جانے کیوں دینی معاملات کے علمی پہلو پر مجھ سے کبھی بات نہیں کرتے تھے۔ کبھی کوئی بات موضوع گفتگو بن بھی جاتا تھا تو وہ ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیتے تھے، اور اس راستے سے ہٹ جاتے تھے۔

ایک وجہ تو اس کی یہ ہو سکتی ہے کہ مجھے ان کے ماضی کا علم تھا۔ اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ اپنے نئے رجحان کے بارے میں مجھ سے باتیں کریں۔

البتہ فوٹو گرافی، موسیقی، مُصوّری اور ادب پر ان سے خوب باتیں ہوتی تھیں۔ وہ بولتے کم تھے لیکن کم لفظوں اور اشاروں کنایوں میں بڑی ہی بلاغت سے ان موضوعات پر اظہارِ خیال کرتے تھے۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگے" مولانا اشرف علی تھانوی کی کتابیں پڑھا کیجیے، اور رسالہ" الحق" کا مطالعہ جاری رکھیے، آپ کو انشاء پردازی کے اعلیٰ نمونوں سے آشنا ہونے کا موقع ملے گا۔"

میں چُپ چاپ سُنتا رہا۔

مجھے اس عالم میں دیکھا تو کہنے لگے" ذرا یوں ہی بیٹھے رہیے۔ میں آپ کی ایک تصویر کھینچوں گا۔"

یہ کہہ کر اُس کمرے کا بٹن دبا جو اُس زمانے میں ہر وقت ان کے ساتھ رہتا تھا۔ تصویریں وہ اسی طرح کھینچتے تھے، اور خوب کھینچتے تھے۔

عسکری صاحب کی زندگی بڑی ہی پاک صاف تھی۔ ان کی دین داری نے اسے اور بھی مُصفّا اور مجلّا کر دیا تھا۔ اور گذشتہ چند سال میں تو میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ ان کے اندر ایک روحانیت پیدا ہو گئی تھی۔ وہ اتنے ڈوب گئے تھے کہ ان میں جذب و کشش کی خصوصیت پیدا ہو گئی تھی۔ اور بعض اوقات تو کشف کا سا عالم ان پر طاری ہو جاتا تھا۔

ایک واقعہ میں کبھی بھول نہیں سکتا۔

دو تین سال اُدھر کی بات ہے میں موسم گرما کی تعطیلات میں چند روز کے لیے کراچی گیا تھا۔ تقریباً ہر دوسرے روز عسکری صاحب سے ملاقات ہوتی تھی، میں ان کے ہاں ضرور جایا کرتا تھا۔ لیکن چار پانچ دن ایسے آئے کہ میں عسکری صاحب کی طرف نہ جا سکا۔ ایک دن میں چار بجے کے قریب سہ پہر کو آرام کر کے اٹھا۔ اس شام مجھے کسی دعوت میں جانا تھا۔ لیکن میں نے گھر والوں سے یہ کہہ کر معذرت کی کہ میں آج عسکری صاحب کی طرف ضرور جاؤں گا۔ چنانچہ میں باہر نکلا اور سواری لے کر کشمیر روڈ کی طرف چل دیا۔ اور ٹھیک پانچ بجے وہاں پہنچ گیا۔ گھنٹی بجائی، عسکری صاحب باہر نکلے۔ کہنے لگے مجھے معلوم تھا کہ آج

آپ پانچ بجے ضرور آئیں گے۔ میں آپ کا انتظار ہی کر رہا تھا۔"

میں نے کہا "اس وقت تو میں ایک پروگرام کو چھوڑ کر آیا ہوں یہاں پہنچنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔"

عسکری صاحب کہنے لگے "مجھے یقین تھا کہ آپ ٹھیک پانچ بجے یہاں پہنچیں گے۔" اور آپ یہاں پہنچ گئے۔

ظاہر ہے کہ یہ صورت حال بغیر کسی روحانیت، جذب و کشش اور کشف کی کیفیت کے پیدا نہیں ہو سکتی۔

بظاہر عسکری صاحب زندگی سے دور بھاگتے ہوئے نظر آتے تھے اور ہر چیز سے بیزار دکھائی دیتے تھے۔ لیکن جن لوگوں نے انہیں قریب سے دیکھا ہے وہ یہ جانتے ہیں کہ انہیں زندگی سے بیحد دلچسپی تھی۔ وہ فنون لطیفہ کے شیدائی تھے۔ زندگی کو اچھی طرح بسر کرنا جانتے تھے۔ محفلیں بھی سجا لیتے تھے۔ گپ بھی کرتے تھے۔ پہاڑوں اور میدانوں میں سیر کے لیے بھی نکل جاتے تھے۔ عزیزوں اور دوستوں کی صحبتوں سے لطف اندوز بھی ہوتے تھے۔ شوق سے پان کھاتے تھے۔ سگریٹ بھی مزے لے لے کر پیتے تھے۔ اچھی چائے سے بھی حظ حاصل کرتے تھے۔ مزے دار کھانے بھی شوق سے کھاتے تھے۔ لباس بھی اچھی طرح پہنتے تھے۔ لیکن اعتدال اور وضعداری کے رنگ ان کی شخصیت کے ان تمام پہلوؤں میں نمایاں رہتے تھے۔

اس لیے ان کو آدم بیزار اور زندگی سے فرار کا علمبردار نہیں کہا جا سکتا۔

یہ صحیح ہے کہ عسکری صاحب نے شادی نہیں کی۔ گھر نہیں بسایا۔ دنیا کے جھگڑوں میں نہیں پھنسے۔ وہ ایک آزاد آدمی تھے اور آزاد رہنا چاہتے تھے، کسی قسم کی پابندیاں، چاہے وہ کسی نوعیت کی ہوں، ان کی برداشت سے باہر تھیں۔ وہ تو صرف ایک پابندی کے قائل تھے اور وہ مطالعہ تھا۔ انہوں نے تو علم و ادب سے شادی کی تھی۔ وہ تو صرف لکھنے پڑھنے کے پابند تھے۔ ویسے وہ اپنے متعلقین کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ انہوں نے

ساری زندگی اپنی والدہ اور اپنے بھائیوں اور بہنوں کی خدمت کی ان کو صحیح راستوں پر ڈالا اور ان کی زندگیاں بنائیں۔ یہ اتنے اہم کام تھے کہ انہیں کبھی گھر بنانے اور بسانے کا خیال تک نہیں آیا۔ اور ان کی زندگی ایک اعتبار سے بہ یک وقت ایک المیہ بھی تھی اور ایک طربیہ بھی!

ایک زمانے میں عسکری صاحب کو فوٹوگرافی سے بڑی دلچسپی تھی۔ انہوں نے ایک اعلیٰ درجے کا کیمرہ خرید لیا تھا۔ اس کیمرے کو وہ بے تکلفی سے گلے میں ڈالے پھرتے تھے اور اپنے شوق اور دلچسپی کی تصویریں کھینچتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس زمانے میں مناظر کی، دوستوں اور عزیزوں ادیبوں اور شاعروں کی زندگی سے بھرپور بے شمار ایسی تصویریں کھینچیں جو منہ سے بولتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔

ایک دن انہوں نے اپنی کھینچی ہوئی بہت سی تصویریں مجھے دکھائیں اور کہنے لگے۔
"میں کسی وقت آپ کی بھی کچھ تصویریں کھینچنا چاہتا ہوں"

چنانچہ ایک روز کیمرہ لے کر آ گئے۔ کہنے لگے "میں آج آپ کی تصویریں کھینچنے آیا ہوں۔ بس آپ جس طرح بیٹھے ہیں بیٹھے رہیے، جو کچھ کر رہے ہیں کرتے رہیے۔ کیمرے کی طرف بالکل نہ دیکھئے، میری موجودگی کو بھی محسوس نہ کیجئے۔ تصویر تو اسی طرح صحیح آئے گی"

میں خاموش بیٹھا رہا اور وہ تصویریں کھینچتے رہے اور اس طرح پوری ایک فلم ختم کر دی۔

چند روز بعد تصویریں لے کر آئے۔ وہ تصویریں واقعی فوٹوگرافی کا شاہکار تھیں۔
دراصل بات یہ ہے کہ عسکری صاحب فنون لطیفہ کے شیدائی تھے۔ فوٹوگرافی سے ان کی یہ دلچسپی بھی فنون لطیفہ اور ان کی انسانی بنیادوں سے دلچسپی کو ظاہر کرتی ہے۔

چند سال ہوئے مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ عسکری صاحب کو موسیقی اور خصوصاً کلاسیکی موسیقی سے بھی گہری دلچسپی ہے۔

ایک دن میں کراچی میں ان کے کشمیر روڈ والے چھوٹے سے فلیٹ میں ملنے کے

لیے پہنچا تو باتوں باتوں میں مجھ سے پوچھنے لگے "آپ کو موسیقی سے بھی کچھ دلچسپی ہے؟"

میں نے کہا "بس سن لیتا ہوں"

کہنے لگے "کلاسیکی موسیقی سے دلچسپی لینی چاہیئے۔ اس سے روحانی سکون ملتا ہے یہ مسلمانوں کے تخلیقی مزاج کی صحیح عکاسی کرتی ہے"

پھر وہ دیر تک بڑے بڑے استادوں کا ذکر کرتے رہے۔ تھوڑی دیر میں ایک اُستاد وہاں آ بھی گئے۔ نہایت ہی نستعلیق آدمی تھے۔ مشرقی تہذیب کا نمونہ کہے جا سکتے تھے۔ ان کا تعارف کرایا۔ اور دیر تک ان سے موسیقی کے موضوع پر باتیں ہوتی رہیں۔ کچھ چیزیں انہوں نے سنائیں بھی۔

اور عسکری صاحب ان کو سُن کر جھومتے اور داد دیتے رہے۔

چند سال ہوئے عسکری صاحب لاہور آئے تو ان کے ساتھ بڑے بڑے اساتذہ کے کچھ ریکارڈ بھی تھے ایک دن انہوں نے مجھے یہ ریکارڈ سنائے۔ ان میں موسیقی کے نمونوں کے ساتھ ساتھ مختلف راگوں اور سروں کی تفصیل بھی تھی جس کو موسیقاروں نے خود پیش کیا تھا۔ کلاسیکی موسیقی کے ریکارڈوں کا ایسا اچھا انتخاب شاید ہی کسی کے پاس ہو۔

دراصل بات یہ ہے کہ عسکری صاحب ایک تہذیب کے آدمی تھے۔ تہذیب ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ اس تہذیب کو انہوں نے اپنے اندر اس طرح جذب کر لیا تھا کہ وہ اس کا مجسمہ معلوم ہوتے تھے۔

اس کا اظہار ان کے افعال و اقوال، اور افکار و خیالات میں ہوتا تھا۔ ان کی تخلیقی کاوشیں، ان کے افسانے اور تنقیدی مضامین اور دینی مقالات ان کے اسی تہذیبی میلان کی آئینہ داری کرتے ہیں۔ اور نثر لکھنے کا جو انداز انہوں نے پیدا کیا ہے اس میں بھی اس تہذیب کی روح مختلف زاویوں سے اپنی جھلکیاں دکھاتی ہے۔

حیرت تو اس بات پر ہے کہ مغربی تہذیب اور مغربی ادبیات کے اتنے بڑے مزاج داں ہونے کے باوجود وہ اپنی تہذیب کے پرستار تھے اور خالص مشرقی طرز پر

زندگی بسر کرتے تھے۔

عسکری صاحب بڑی محبت کے آدمی تھے، جس سے ملتے تھے محبت اور خلوص کے ساتھ ملتے تھے۔ مجھ پر تو ان کی خاص نظر اخلاص تھی۔ میرے لیے ہمیشہ دعا کرتے تھے۔ میری بہتری کی تدبیریں سوچتے تھے۔ اکثر یہ کہتے تھے اور بار بار کہتے تھے کہ میں تو آپ کو انتہائی بلندیوں پر دیکھنا چاہتا ہوں۔ میری کتابوں کی ضرورت سے زیادہ تعریف کر دیتے تھے۔ ہر ہفتے مجھے خط ضرور لکھتے تھے، اور ان خطوں میں دنیا جہاں کی باتیں ہوتی تھیں، لیکن تان یہیں پر جاکر ٹوٹتی تھی کہ میں آپ کے لیے دعا کرتا رہتا ہوں۔ اللہ تعالےٰ آپ کو خیریت سے رکھے!

شاید اس وجہ سے کہ انہیں اس بات کا علم تھا کہ میرے آس پاس بعض ایسے لوگ موجود ہیں جن کا کام صرف فساد پھیلانا ہے اور جو صرف شر کے سہارے زندہ ہیں۔

عسکری صاحب ہم سے اچانک رخصت ہو گئے۔ میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں نہیں تھا کہ وہ اس طرح ہم سے چپ چپاتے رخصت ہو جائیں گے کہ کالج جاتے ہوئے سڑک پہ گریں گے۔ طالب علم انہیں ایک ٹیکسی میں ڈال کر ان کے کشمیر روڈ والے چھوٹے سے فلیٹ میں لے جائیں گے، وہاں پہنچ کر وہ ٹیکسی کا کرایہ ادا کریں گے۔ لیکن سیڑھیاں چڑھ کر جب اوپر اپنے کمرے میں پہنچیں گے تو ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی ہوگی۔

ان کی موت میرے لیے صرف ایک مفکر، ادیب، اور انشاء پرداز ہی کی موت نہیں ہے ایک عظیم انسان، ایک مخلص دوست، ایک ہمدرد اور ایک بہی خواہ کی موت بھی ہے۔

عسکری صاحب میرے لیے تو خلا ہی خلا چھوڑ گئے ہیں۔ اب میں ہر لمحہ یہ سوچتا ہوں کہ عسکری صاحب تو رخصت ہو گئے۔ اب مجھے ہر ہفتے خط کون لکھے گا۔ میرے لیے دعائیں کون مانگے گا۔ مجھے تسلی کون دے گا۔ غائبانہ میرا ذکر اپنی محفلوں میں کون کرے گا۔ کراچی کے کتب فروشوں کی دوکانوں میں جاکر میرے لیے کتابوں کا انتخاب کون کریگا۔ میری کتابوں کے فلیپ کون لکھے گا۔ اور میرے کاموں کی داد کون دے گا تو بس حد نظر تک مجھے خلا ہی خلا نظر آتا ہے اور اس مغائرت اور تنہائی کے شدید احساس کی وجہ سے ہر لمحہ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کلیجہ منہ کو آ رہا ہے۔

صوفی غلام مصطفےٰ تبسّم

صُوفی صاحب سدا بہار آدمی تھے۔

لیکن اب یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ صوفی صاحب کو نظر لگ گئی، ورنہ وہ اس طرح چُپ چُپاتے ہم سب کو چھوڑ کر رخصت نہ ہو جاتے۔ وہ اچھے خاصے لاہور سے اسلام آباد گئے تھے۔ صرف تین دن وہاں رہے۔ چوتھے دن لاہور واپس آ رہے تھے کہ لاہور اسٹیشن پر ریل گاڑی ہی میں ان کی طبیعت کچھ خراب ہوئی۔ اسٹیشن سے باہر نکلے ٹیکسی میں بیٹھے لیکن گھر تک مشکل سے پہنچنے پائے۔ راستے ہی میں اس دُنیا سے رخصت ہو گئے۔

اُن میں مرنے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے اُن کی صحت اچھی تھی۔ وہ اس عمر میں بھی جوانوں سے زیادہ جوان نظر آتے تھے۔ وہ ہر وقت چاق و چوبند رہتے تھے۔ وہ ہر میٹنگ میں وقت سے پہلے پہنچتے تھے۔ وہ ہر دعوت اور ہر تقریب میں باقاعدگی سے شرکت کرتے تھے۔ کبھی اسلام آباد، کبھی پشاور، کبھی ملتان، کبھی کراچی اور کبھی کابل اور تہران میں نظر آتے تھے۔ اُن کی سُرخ رنگ کی فرانسیسی موٹر کار لاہور شہر میں ہر وقت چلتی ہی رہتی تھی اور اس بات کا اعلان کرتی تھی کہ صوفی صاحب جوانوں سے بھی زیادہ جوان ہیں اور وقت اُن کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

لیکن صوفی صاحب کو نظر لگ گئی۔

ابھی چند روز کی بات ہے صوفی صاحب مجھے مجلس ترقی ادب کی میٹنگ میں

ہے۔ وہ خوب تروتازہ اور زندگی سے بھرپور نظر آ رہے تھے۔

انہوں نے ایک زمانے کے بعد نہایت ہی عمدہ سوٹ زیب تن کیا تھا۔ سر پر نہایت ہی خوبصورت قراقلی کی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں نہایت ہی ٹیپ ٹاپ بوٹ تھا۔ ٹائی بھی حد درجہ جاذب نظر تھی۔ غرض صوفی صاحب اس سوٹ بوٹ میں بہت ہی خوبصورت نظر آ رہے تھے۔

میٹنگ ختم ہوئی تو مجھ سے نہ رہا گیا۔

میں نے کہا "صوفی صاحب! آج آپ بہت ہی اچھے لگ رہے ہیں۔ تیس چالیس سال پہلے کی یاد تازہ ہو گئی ہے۔ آپ آج گھر جا کر نظر ضرور اتروایئے گا"

صوفی صاحب یہ سن کر اپنے مخصوص انداز میں مسکرائے۔ میرے تاثر کو تحسین کی نظروں سے دیکھا اور کچھ نہ کہنے کے باوجود بہت کچھ کہہ دیا۔

بات آئی گئی ہو گئی۔

چند روز کے بعد صوفی صاحب ایک اور میٹنگ میں ملے۔

کہنے لگے "پرسوں تم نے میری بہت تعریف کی۔ سن کر جی خوش ہوا، معلوم ہوا جیسے میں پچاس سال پیچھے پہنچ گیا ہوں۔ اسی دن میں ایک فوٹو گرافر کے پاس گیا، اور اس سے کہا کہ "آج میرے ایک دوست نے میری بہت تعریف کی ہے، اس طرح جیسے وہ مجھ پہ عاشق ہو گیا ہو۔ تم میری ایک اچھی سی تصویر بناؤ تا کہ یادگار رہے"

فوٹو گرافر نے پوچھا "صوفی صاحب! تعریف کس نے کی"

صوفی صاحب نے میرا نام لیا۔

وہ فوٹو گرافر مجھے جانتا تھا۔ کہنے لگا "میں ضرور اچھی سی تصویر بنا دوں گا، اور ایک کاپی انہیں بھی دوں گا"

لیکن یہ تصویر صوفی صاحب کو نہ مل سکی، وہ اس کے تیار ہونے سے پہلے ہی ہو گئے، اور ایک ایسے سفر پر چل دیے جہاں سے کوئی کبھی بھی لوٹ کر نہیں آتا۔

اور میں اب بھی یہ سوچ رہا ہوں کہ صوفی صاحب نے نظر نہیں اتروائی انہیں نظر لگ گئی۔ ورنہ یہ سب کچھ نہ ہوتا۔

میں نے صوفی صاحب کو تقریباً تیس سال تک بہت قریب سے دیکھا۔ اور وہ ہمیشہ مجھے ایک مخلص دوست، ایک شفیق استاد، ایک بلند پایہ شاعر، ایک منفرد ادیب اور ایک دُور بیں نقاد کے روپ میں نظر آئے۔ لیکن ان کی شخصیت کے ان تمام پہلوؤں کے ساتھ جو پہلو مجھے سب سے زیادہ نمایاں نظر آیا وہ یہ تھا کہ بڑھاپے میں بھی وہ ایک بچے کی طرح معلوم ہوتے تھے۔ ان میں ایک عجیب طرح کی سادگی اور معصومیت تھی۔ ان کا ظاہر اور باطن ایک تھا۔ وہ کوئی بات کسی سے چھپا نہیں سکتے تھے۔ سب کچھ کہہ دیتے تھے۔ جو کچھ دل میں آتا تھا، اس کا اظہار کر دیتے تھے۔ سچائی ان کا سب سے بڑا وصف تھا۔ وہ حُسن کے شیدائی تھے اور زندگی کے ہر پہلو میں انہیں حسُن نظر آتا تھا۔ اس حسُن کو دیکھنے اس تک پہنچنے، اور اس کو حاصل کرنے کے لیے جو تڑپ ان کے ہاں نظر آتی تھی، اس سے صوفی صاحب پہچانے جاتے تھے۔

اور اس تڑپ سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بالکل بچے ہیں۔

لاہور آنے سے قبل میں نے صوفی صاحب کے بارے میں بہت کچھ سُن رکھا تھا۔ قیامِ پاکستان سے قبل دہلی میں جن ادیبوں اور شاعروں کا جمگھٹا تھا، اُن میں سے بیشتر صوفی صاحب کے شاگرد تھے۔ وہ اکثر مجھ سے صوفی صاحب کی باتیں کرتے، اُن کا نام ہمیشہ احترام سے لیتے اور یہ کہتے کہ وہ ادیب اور شاعر گر ہیں۔ اُن کی صحبت میں جو بیٹھا وہ ادیب اور شاعر ہو گیا، اور یہ کہ انہوں نے گورنمنٹ کالج لاہور میں ادب کا ایک ماحول پیدا کر رکھا ہے۔ فیض، راشد اور اُن کے بیشتر ہم عصر صوفی صاحب کے بنائے ہوئے ہیں۔

میں نے جب سے یہ سُنا تھا، مجھے صوفی صاحب سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا۔ چنانچہ جب میں لاہور آیا تو اُن سے گورنمنٹ کالج میں ملنے گیا۔ صوفی صاحب بڑی محبت

سے ملے، دیر تک باتیں کرتے رہے۔ ایک لمحے کو انھوں نے یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ میں پہلی دفعہ اُن سے مل رہا ہوں۔ ایسے گھُل مِل کر باتیں کیں کہ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے برسوں سے ملاقات ہے۔

جب میں نے اجازت لی اور رُخصت ہونا چاہا تو کہنے لگے "بھئی، پرسوں میرے ہاں نیو ہوسٹل میں آیئے۔ میں آپ کو کشمیری کھانا کھلاؤں گا۔" میں نے وعدہ کر لیا۔

میں دو دن بعد مقررہ وقت پر صوفی صاحب کے ہاں پہنچا تو یونیورسٹی اور گورنمنٹ کالج کے کچھ پروفیسر اور چند ادیب اور شاعر جمع تھے۔ صوفی صاحب نے ہمیں خالص کشمیری کھانا کھلایا جو بہت مزے دار تھا۔ کھانے کے بعد شعر و شاعری کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور باتیں بھی ہوتی رہیں۔ صوفی صاحب نے اس دن کئی غزلیں سنائیں، اور اُن کی غزلیں سن کر مجھے لطف آیا۔ باتیں بھی بہت ہوئیں۔ بہت اچھا وقت گذرا۔

اُس کے بعد صوفی صاحب سے ہر دوسرے تیسرے روز ملاقات ہوتی رہی۔ اس زمانے میں وہ اورینٹل کالج میں ایم۔اے کی جماعت کو لکچر دینے کے لیے آتے تھے۔ معمول یہ تھا کہ لکچر دینے سے پہلے میرے کمرے میں آتے۔ چائے۔ پیتے پان کھاتے، پھر لکچر دینے کے لیے جاتے۔ برسوں اُن کا یہی معمول رہا۔

چند سال بعد صوفی صاحب گورنمنٹ کالج لاہور سے ریٹائر ہو گئے۔ گورنمنٹ کالج نیو ہوسٹل انھوں نے چھوڑ دیا۔ دیو سماج روڈ پر اپنے بھائی کے مکان میں چلے گئے۔ وہاں کچھ وقت گذارا، لیکن پھر جب سمن آباد میں انھوں نے اپنا مکان بنا لیا تو ہمسائے ہونے کی حیثیت سے ان سے زیادہ ملنے کا موقع ملا۔

صبح کی سیر میں اکثر ان کا ساتھ ہو جاتا تھا۔ صوفی صاحب تیز چلتے تھے۔ باغ کے بے شمار چکر لگاتے تھے، اور بالکل نہیں تھکتے تھے۔ میں تھک جاتا تھا تو اُن سے اجازت لیتا تھا۔ لیکن میرے چلے جانے کے بعد بھی اُن کی سیر جاری رہتی تھی۔

صبح کو کئی گھنٹے سیر کرنا ہمیشہ سے ان کا معمول رہا۔ لیکن وہ سیر صرف اس خیال

سے نہیں کرتے تھے کہ اس سے صحت پر اچھا اثر ہوگا، بلکہ اس لیے کہ صبح کا منظر خوبصورت ہوتا ہے، اور صبح کے وقت ہر چیز حسین نظر آتی ہے۔ ہر شے پر ایک رعنائی کا عالم ہوتا ہے۔ اسی لیے صبح کی سیر اُن کے لیے صرف ورزش نہیں تھی بلکہ وہ اس کو مناظر سے لطف اندوز ہونے اور ہر حسین چیز کے حسن سے سینہ بھر لینے کا ایک ذریعہ اور وسیلہ سمجھتے تھے۔

میں برسوں اُن کے ساتھ صبح کی سیر میں شریک رہا ہوں۔ اور میں نے یہ دیکھا ہے کہ جہاں وہ سیر کرتے تھے وہاں کے ایک ایک پودے سے، ایک ایک پھول اور ایک ایک پتے سے انہیں ایک نسبت خاص تھی۔ وہ ان سب کو غور سے دیکھتے اور اُن سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ درختوں میں پتوں کے پھوٹنے اور کلی کے پھول بننے کا عمل تک اُن کی توجہ کا مرکز تھا۔ ہوا کا چلنا، سبزے کا لہلہانا، پھوار کا پڑنا، رم جھم رم جھم مینہ برسنا، سورج کا طلوع ہونا، دھوپ کا پھیلنا، چاند کا نکلنا، چاندنی کا دُور دُور تک بکھرنا، یہ سب کچھ اُن کے ذوقِ جمال کو دعوتِ نظارہ دیتے تھے اور ان کا زیادہ وقت انہیں مناظر کے درمیان گذرتا تھا۔

ایک دن دیکھا صوفی صاحب ایک چھوٹے سے پودے کے پاس کھڑے ہیں۔ جھک کر اس کے نمو کی کیفیت کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ اتفاق سے میں بھی وہاں پہنچ گیا۔

میں نے پوچھا "صوفی صاحب، اس پودے میں کیا کوئی خاص بات ہے؟

بولے "دیکھیے کیسی خوبصورتی سے اس میں کونپلیں پھوٹ رہی ہیں۔ میں اسی کیفیت کو غور سے دیکھ رہا تھا"

اور میں یہ سوچتا رہا کہ صوفی صاحب کو زندگی اس کی نمو اور اس کے حسن و جمال سے کتنی دلچسپی ہے!

موسم بہار میں تو واقعی صوفی صاحب درختوں، پتوں، اور پھولوں کی بہاریں لوٹتے تھے۔ کبھی بگن ویلیا کو دیکھ رہے ہیں۔ کبھی ڈہلیا کا نظارہ کر رہے ہیں کبھی کاسموس سے لطف اندوز ہو رہے، کبھی سوئٹ پیز کی خوشبو سے اپنی روح کو بیدار کر رہے ہیں۔ کبھی گلاب سے خود اپنے

اندر مہک پیدا کر رہے ہیں۔

جب وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں باغ کے نگران تھے، اس زمانے میں لوگوں نے اکثر انہیں درختوں، پھولوں اور پتوں کی صحبت میں محو کلام دیکھا ہے۔ وہ واقعی ان سے باتیں کرتے تھے۔ ریٹائر ہونے کے بعد بھی اُن کا یہ معمول تھا کہ ہفتے میں کئی بار گورنمنٹ کالج جاتے اور اپنے لگائے ہوئے پودوں کو دیکھتے۔

صوفی صاحب کو اچھے اور خوبصورت لباس سے بھی بڑی دلچسپی تھی۔ مشرقی اور مغربی دونوں طرز کا بہترین لباس زیب تن کرتے تھے۔ ادھر کچھ عرصے سے مغربی لباس انہوں نے چھوڑ دیا تھا۔ لیکن ان کی شیروانی، شلوار قمیض، قراقلی کی ٹوپی اور کامدار جوتی سب ان کے ذوقِ جمال کی داد دیتے تھے۔ صوفی صاحب نے اس رچے ہوئے ذوق جمال سے اپنے روایتی لباس میں جان ڈالی اور اس کو زندہ کیا۔ شوخ رنگ کے لاچے اور کام دار جوتے انہوں نے ہمیشہ شوق سے استعمال کیے۔ ملتان، جھنگ اور نہ جانے کہاں کہاں سے وہ یہ روایتی انداز کے خوبصورت لاچے اور سنہرے کامدار جوتے منگواتے تھے۔ انہیں بے تکلفی کے ساتھ زیب تن کرتے تھے کہ جی خوش ہو جاتا تھا اور ان کے ذوق لطیف کی داد دینی پڑتی تھی۔

صوفی صاحب حسن نسوانی کے دلدادہ تھے۔ یہ ان کی کمزوری بھی تھی۔ گفتگو میں اس کا ذکر نہیں کرتے تھے۔ البتہ ان کی شاعری میں اس کا اظہار شد و مد سے ہوتا تھا۔ یا پھر عملی طور پر زندگی کے متعلق اُن کے مختلف رویّوں سے اس پہلو کی وضاحت ہوتی تھی۔ صوفی صاحبؒ کے اس رویّے کو دیکھ کر مجھے تو جگر صاحب کا یہ شعر اکثر یاد آجاتا تھا۔

اگر نہ زہرہ جبینوں کے درمیاں گزرے
تو پھر یہ زندگی کیسے کٹے کہاں گزرے

بچّوں سے صوفی صاحب کو گہرا لگاؤ تھا۔ سارے محلے کے بچّے ان کے بچّے تھے۔ راہ چلتے شیر خوار بچّوں تک کو وہ اپنی گود میں لے لیتے تھے۔ کچھ چھوٹے بچّے انہیں اپنے شاعر کی حیثیت سے جانتے اور پہچانتے تھے۔ صوفی صاحب کو راستے میں مل

جاتے تو اُن سے دوستی کا اظہار کرتے۔ صوفی صاحب کو دیکھا کہ کسی کو ٹافی دے رہے ہیں، کسی کو مٹھائی کھلا رہے ہیں، کسی کو کوئی کھلونا دے رہے ہیں۔ غرض خاصا وقت وہ بچّوں کی صحبت میں گزارتے تھے۔ بچوں سے انہیں ایسا پیار تھا کہ کم لوگوں کو ہوگا۔

ایک شاعر ایک ادیب اور ایک استاد کی حیثیت سے صوفی صاحب انسانی رشتوں کے بہت بڑے نبّاض تھے، اور اس صورتِ حال نے انہیں خاصا جذباتی بنادیا تھا۔ وہ اپنے عزیزوں اور دوستوں سے بڑی محبت کرتے تھے۔

اُن کی والدہ نے طویل عمر پائی، وہ غالباً ۹۵ سال کی عمر تک زندہ رہیں۔ صوفی صاحب اُن کی خدمت کرتے تھے۔ خاصا وقت اُن کے پاس بیٹھ کر گزارتے تھے، اور اکثر یہ کہتے تھے، کہ "جب میں اپنی والدہ کے پاس بیٹھتا ہوں تو مجھے یہی محسوس ہوتا ہے جیسے میں ساٹھ ستر سال پیچھے چلا گیا ہوں۔ ان کے پاس بیٹھنے میں کچھ ایسی لذت محسوس ہوتی ہے کہ الفاظ میں بیان نہیں کرسکتا۔"

اور پھر جب صوفی صاحب کے انتقال سے دو سال قبل اُن کی والدہ کا انتقال ہوا اور میں تعزیت کے لیے گیا تو صوفی صاحب مجھ سے کہنے لگے "عابد صاحب! آج معلوم ہوا کہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔"

زندگی کے آخری چند سال ایسے تھے جب اُن کا زیادہ وقت وقار عظیم صاحب کے ساتھ گذرتا تھا، دونوں اسمبلی چیمبرز میں مجلس زبان دفتری میں کئی کئی گھنٹے اصطلاحات سازی کا کام کرتے تھے۔ ٹیلی ویژن پر بھی ساتھ ساتھ جاتے تھے۔ میٹنگوں میں جانے کے لیے ایک ساتھ گھر سے نکلتے تھے۔

جب وقار صاحب کا انتقال ہوا تو صوفی صاحب کی زندگی میں ایک بہت بڑا خلا پیدا ہوا۔ میرے سامنے کئی بار اس طرح روئے کہ ہچکی بندھ گئی اور کہا کہ میری کمر ٹوٹ گئی ہے، میرا بھائی اس دنیا سے اُٹھ گیا ہے۔ اب تو بس تنہائی ہی تنہائی ہے۔

اور یہ احساس تنہائی ہمیشہ صوفی صاحب پر چھایا رہا۔ وہ احباب کے بچھڑنے

کو بہت محسوس کرتے تھے اور جب بھی کوئی عزیز یا دوست بچھڑ جاتا تھا تو یہ احساس تنہائی اُن کے ہاں شدید سے شدید تر ہو جاتا تھا اور صوفی صاحب اُداس ہو جاتے تھے۔

اس اُداسی نے زندگی بھر صوفی صاحب کا ساتھ نہیں چھوڑا۔

صوفی صاحب کی عمر کا بیشتر حصّہ درس و تدریس میں گذرا۔ اپنے بعض اساتذہ اور رفقائے کار کا ذکر وہ بڑی عقیدت سے کرتے تھے۔ پڑھانا اور درس دینا اُن کے نزدیک ایک فن تھا اور اس میں شُبہ نہیں کہ صوفی صاحب درس و تدریس کے فن کار تھے۔ اپنے طالب علموں سے بڑی شفقت اور محبت کا اظہار کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اُن کے ذاتی مسائل تک کو حل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے طالب علموں کے لیے کبھی اپنے دروازوں کو بند نہیں کیا۔ ہر طالب علم کسی وقت بھی اُن سے مِل سکتا تھا۔ صوفی صاحب کو طالب علموں کو شیشے میں اتارنے، انہیں انسان بنانے اور انہیں تہذیب و شائستگی سے ہمکنار کرنے کا گرُ خوب آتا تھا۔ اُن کے شاگرد، جن کی تعداد ہزاروں اور لاکھوں تک پہنچتی ہے ابھی اُن کے اس کارنامے کو فراموش نہیں کر سکتے۔

طالب علموں کو دوست بنا لینے کا فن بھی صوفی صاحب کو خوب آتا تھا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اُن کے بیشتر اچھے طالب علم اُن کے دوست بھی تھے۔

صوفی صاحب بڑے ہی انسان دوست آدمی تھے۔ وہ انسانی کمزوریوں کو خوب جانتے اور سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ نکتہ چینی سے انہیں دور کا واسطہ بھی نہیں تھا۔ میں نے صوفی صاحب کو کبھی کسی کی بُرائی کرتے ہوئے نہیں سُنا۔ اگر کسی سے کوئی غلطی ہو بھی جائے تو وہ یہ کہہ کر نظر انداز کر دیتے تھے کہ "یار! آخر وہ انسان ہے، انسان سے غلطی ہو سکتی ہے۔ اور اس کی غلطی یا بُرائی کو معاف کر دینا چاہیئے"

ایم۔ اے کی تدریس کے سلسلے میں وہ ایک زمانے تک اورینٹل کالج کے ساتھ بھی وابستہ رہے۔ برسوں انہوں نے اس کالج میں ایم۔ اے فارسی اور اردو کے طلباء کو درس دیا۔ فارسی اور اردو بورڈ کے کنوینر بھی رہے۔ بعض لوگ جنہوں نے کالج اور یونیورسٹی کے

ماحول کو ایک اکھاڑہ بنا دیا تھا، صوفی صاحب انہیں ہمیشہ سمجھاتے تھے اور انہیں راہ راست پر لانے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کے زمانے میں سیاست اور سازش کم تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ صوفی صاحب بہت لیے دیئے رہتے تھے۔ ہر ایک کی عزت کرتے تھے اور ہر ایک کا خیال رکھتے تھے۔

میں نے تعلیمی اداروں میں ایسے معاملہ فہم، مرنجاں مرنج اور انسان دوست آدمی کم دیکھے ہیں جیسے کہ صوفی صاحب تھے۔

صوفی صاحب کو سچائی اور صداقت کا پیکر کہا جائے تو ایسا کچھ بے جا نہیں۔ وہ ہمیشہ سچ بولتے تھے، کسی ایسی ویسی بات کو چھپاتے نہیں تھے۔ بلکہ برملا اس کا اظہار کر دیتے تھے۔ ان میں کمزوریاں بھی تھیں اور کمزوریاں کس انسان میں نہیں ہوتیں۔ لیکن وہ ان پہلوؤں کو پوشیدہ نہیں رکھتے تھے۔ اُن پر پردہ نہیں ڈالتے تھے۔ سب کچھ بتا دیتے تھے۔

مجھ سے اکثر کہتے تھے کہ "میرے ایک بھائی نان اور شیرمال بہت عمدہ بناتے ہیں اُن کا تنور بہت مشہور ہے اور وہ اس کام میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔"

چنانچہ جب بھی اُنہوں نے کھانے پر بلایا اپنے بھائی کے بنائے ہوئے نان خاص طور پر منگوائے اور اس حقیقت کا اظہار کر کے کھلائے۔ کوئی دوسرا ہوتا تو شاید اس حقیقت کو چھپانے کی کوشش کرتا۔ لیکن صوفی صاحب میں اس قسم کا کوئی حجاب نہیں تھا۔

صوفی صاحب بڑے ہی بے نیاز قسم کے انسان تھے۔ ان کی بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ تقریباً چالیس سال کی ملازمت میں انہوں نے کبھی گورنمنٹ کالج لاہور کو چھوڑنے کا خیال دل میں پیدا نہیں کیا۔ کئی بار انہیں پرنسپل کی حیثیت سے لاہور سے باہر بھیجے جانے کے احکامات صادر ہوئے لیکن وہ لاہور کی علمی، تعلیمی، ثقافتی اور ادبی دلچسپیوں کو خیرباد کہنے کے لیے آمادہ نہ ہوئے۔ حالانکہ مادی اعتبار سے اس طرح ان کا خاصا نقصان بھی ہوا۔ صوفی صاحب نے کبھی اس کی پروا نہیں کی۔ وہ کبھی لاہور سے باہر جا کر نہیں رہے، اور انہوں نے گورنمنٹ کالج لاہور اور اورینٹل کالج کو کبھی اپنے دل سے نہیں نکالا۔

گورنمنٹ کالج کے ساتھ انہیں دلی وابستگی اور محبت تھی۔ اور وہ اس وابستگی اور محبت ہی کو زندگی سمجھتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ انہوں نے ساری زندگی گورنمنٹ کالج ہی میں گزار دی۔ کبھی انہیں کہیں اور جانے کا خیال نہیں آیا۔

صوفی صاحب اپنی ذات سے ایک انجمن تھے۔ محفلیں سجانا اور بزم آرائیاں کرنا ان کے مزاج میں داخل تھا۔ وہ استاد تھے، شاعر تھے، ادیب تھے، اور ہر حیثیت سے ان کی شخصیت میں انجمن آرائی کا احساس سب سے پہلے ہوتا ہے۔ دراصل وہ ایک رچی ہوئی تہذیب کے علمبردار تھے۔ اس تہذیب کو انہوں نے اپنی شخصیت میں جذب کر لیا تھا، اور اس کے جلوۂ صد رنگ کو اپنی شخصیت کا جز بنا لیا تھا۔ یہ تہذیب اپنی تمام رعنائیوں اور جلوہ سامانیوں کے ساتھ صوفی صاحب کے حسن ذوق، حسن اخلاق اور حسن کردار میں پوری طرح بے نقاب نظر آتی تھی۔

اس تہذیب کے مختلف روپ صوفی صاحب کی جذباتی اور جمالیاتی زندگی میں اپنا جلوہ دکھاتے تھے۔ ان کے دلآویز رہن سہن، لطیف انداز گفتگو، اُن کا جاذب نظر لباس، اُن کی صاف ستھری کتابوں، اُن کے لطیف حقّے، اُن کی خوبصورت پانوں کی ڈبیا، اُن کے حسین بٹوے، اُن کے دلکش لائٹر، غرض یہ کہ ان کی ہر چیز میں اس تہذیب لطیف کی جھلک نظر آتی تھی۔ صوفی صاحب نے اپنی ساری زندگی اسی تہذیب کے سائے میں گذاری۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی شخصیت اس تہذیب کا آئینہ معلوم ہوتی تھی۔

صوفی صاحب اس تہذیب کے شاہکار تھے، اور اسی تہذیب نے انہیں ایک سدا بہار آدمی بنایا تھا۔

سلسلۂ مطبوعات ادارۂ ادب و تنقید لاہور ۳

آوارگانِ عشق

(۱) شاعر شہر نگاراں اسرار الحق مجاز (۲) ثناء اللہ خاں میراجی (۳) ناصر کاظمی (۴) پروفیسر محمد حسن عسکری (۵) پروفیسر صوفی غلام مصطفٰی تبسم

کی

شخصیتوں کے مرقعے

مصنف

ڈاکٹر عبادت بریلوی

ناشر

ادارۂ ادب و تنقید لاہور

سلسلۂ مطبوعات ادارۂ ادب وتنقید، لاہور ۔ ٦

○

تنقید اور اصُولِ تنقید

○

مصنّف
ڈاکٹر عبادت بریلوی

○

—— موضوعات ——

(١) تنقید کیا ہے؟ (٢) ادبی تنقید کے بُنیادی اصول (٣) رومانی تنقید (٤) تنقید کے نئے دبستان (٥) تحقیق وتنقید (٦) اُردو میں تنقید کی روایت (٧) اُردو تنقید میں نئے تجربے (٨) حالی کی تنقید (٩) شبلی کی تنقید (١٠) آزاد کی تنقید (١١) پروفیسر سیّد احتشام حسین کی تنقید (١٢) میراجی کا تنقیدی شعور

○

—— ناشر ——

اِدارۂ ادب وتنقید، لاہور

سلسلۂ مطبوعات ادارۂ ادب و تنقید، لاہور ۲

○

ادب اور ادبی قدریں

○

مصنّف

ڈاکٹر عبادت بریلوی

○

اس کتاب میں مندرجہ ذیل موضوعات پر تنقیدی زاویۂ نظر سے اظہارِ خیال کیا گیا ہے

(۱) ادب کیا ہے؟ (۲) ادب کی بنیادی قدریں (۳) ادبی تخلیق کی نفسیات

(۴) ادب میں اسلوب کا مسئلہ (۵) ادب اور عوام (۶) ارتقائی ادب

(۷) ادبی تخلیق میں تجربے کی اہمیت (۸) ادب، ادیب اور تاریخی شعور

(۹) کلاسیکی ادب کا مطالعہ (۱۰) ادب کا مستقبل

○

ناشر

ادارۂ ادب و تنقید، لاہور

سلسلۂ مطبوعات ادارۂ ادب وتنقید لاہور نمبر۲

○

رہ نوردانِ شوق

○

(۱) بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق (۲) رئیس الاحرار مولانا حسرت موہانی
(۳) رئیس المتغزلین حضرت جگر مرادآبادی (۴) حضرت مولانا ابوالکلام آزاد

کی

شخصیتوں کے مرقّعے

○

مصنّف

ڈاکٹر عبادت بریلوی

○

ناشر

اِدارۂ ادب وتنقید لاہور

سلسلۂ مطبوعات ادارۂ ادب وتنقید، لاہور ۵

افسانہ اور افسانے کی تنقید

مصنف

ڈاکٹر عبادت بریلوی

—موضوعات—

(۱) مختصر افسانے کا فن (۲) ناول، ناولٹ اور طویل مختصر افسانہ (۳) ناول کے نئے رجحانات (۴) اردو افسانے کا ارتقا (۵) اردو افسانوں میں حقیقت نگاری (۶) منٹو کی افسانہ نگاری (۷) قرۃ العین حیدر (۸) کرشن چندر (۹) احمد ندیم قاسمی (۱۰) انتظار حسین (۱۱) جیلانی بانو (۱۲) اردو افسانے میں روایت اور تجربے (سمپوزیم)

—ناشر—

ادارۂ ادب وتنقید، لاہور

ڈاکٹر عبادت بریلوی

کی

کتابیں